بلیک اینڈ وائٹ

(افسانوں کا مجموعہ)

طاہر انجم صدیقی

بلیک اینڈ وائٹ

(افسانے)

مُصنّف

طاہر انجم صدیقی

المریم پبلشنگ ہاؤس

© رخسانہ طاہر

(اس کتاب کے کسی بھی افسانے پر فلمبندی کی قطعی اجازت نہیں نیز کتاب کے کل فرضی واقعات، مقامات، کرداروں اور ناموں کی کسی اتفاقیہ مطابقت سے مصنف، طابع اور ناشر بری الذمہ ہیں اور اس کتاب کے تعلق سے کسی بھی امر پر شنوائی صرف اور صرف مالیگاؤں کی ہی عدالت میں ہوگی۔)

کتاب کا نام	:	"بلیک اینڈ وہائٹ"
مصنف کا نام	:	طاہرانجم صدیقی
ترتیب وتہذیب	:	ڈاکٹر اقبال برکی
زیر سرپرستی	:	ہارون بی اے، سجاد عزیز، احمد عثمانی، خان انعام الرحمٰن
زیر نگرانی	:	ریاض احمد، سعید احمد، سرفراز احمد مہدی حسن
ٹائٹل+کمپوزنگ	:	فہیم احمد (طوبیٰ کمپیوٹرس، مالیگاؤں فون:02554-235165)
اشاعت اوّل	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	۵۰۰
تقسیم کار	:	محمد صدیق محمد عمر
قیمت	:	روپے
		-/70 روپے (لائبریری، اکیڈمی اور کلبوں کیلئے)

کتاب ملنے کے پتے

☆ سویرا بکڈپو محمد علی روڈ روڈ، نزد جنتا لاج، مالیگاؤں
☆ نیو سویرا بکڈپو عزیز کلوتا ور، محمد علی روڈ، نیا پورہ، مالیگاؤں
☆ اطفال بکڈپو محمد علی روڈ، اسلام پورہ، مالیگاؤں
☆ سٹی بکڈپو قصاب باڑہ مسجد، محمد علی روڈ، مالیگاؤں

المریم پبلشنگ ہاؤس، مالیگاؤں
طاہرانجم صدیقی، 31، انصار گنج، پہلی گلی، مالیگاؤں
مسوّدہ لائیے اور کتاب لے جائیے۔

انتساب

اُن کالی رتوں کے نام .....

جن کی آہٹ سے سفیدی پر خطروں کے سیاہ بادل منڈلانے لگے

جن کی آمد پر مظالم کے دروازے کھولے گئے.....

جن کی موجودگی میں پاکیزہ عصمتوں کے دامن تار تار کیے گئے.....

جن کی نظروں کیسامنے ماؤں کے شکم چیر کران میں

پرورش پاتی معصوم جانوں کو نیزوں بھالوں اور ترشولوں کی نوک پر اچھالا گیا

جن کے استقبال کیلئے بستیاں پھونک ڈالی گئیں ....

جن کے نام پر تاریخ میں ظلم و بربریت اور درندگی.....

کے سیاہ ترین باب کا اضافہ کیا گیا .....

فہرست

☆ اپنی بات (مصنف) ------ ۵
☆ پیش لفظ (شبیر ہاشمی) ------ ۶
☆ تقریظ (ڈاکٹر اقبال برکی) - ۹
☆ تاثر (حمید شیخ) ------ ۱۰

۱ - آخری آدم زاد ------ ۱۱
۲ - عید گزیدہ ------ ۱۳
۳ - بائیں طرف کا منظر ------ ۱۶
۴ - راستہ ------ ۱۸
۵ - کیری بیگ ------ ۲۲
۶ - ایک تھا بجوکا ------ ۲۴
۷ - باپو کا کا ------ ۲۹
۸ - درندے ------ ۳۴
۹ - ہندوستانی ------ ۳۸
۱۰ - لائن آف کنٹرول ------ ۴۰
۱۱ - بند دروازہ ------ ۴۳
۱۲ - ہمدرد ------ ۴۹
۱۳ - کمال ------ ۵۲
۱۴ - بگولوں کے درمیان ------ ۵۴
۱۵ - دوسرا تیر ------ ۵۷
۱۶ - اولڈ از گولڈ ------ ۶۱
۱۷ - پلانے ------ ۶۳
۱۸ - بلیک اینڈ وہائٹ ------ ۶۷
۱۹ - ذکر اس پری وش کا ------ ۷۴
۲۰ - ابلیس اعظم ------ ۸۱
۲۱ - خوف ------ ۸۵
۲۲ - پاگو ------ ۸۸
۲۳ - چراغ ------ ۹۲
۲۴ - ابھی انسان زندہ ہے ------ ۹۴
۲۵ - روشنی کی تلاش ------ ۹۹
۲۶ - اندر اترتی تاریکی ------ ۱۰۴
☆ باتیں میرے ہمعصروں کی ---- ۱۱۰

اللہ

کے نام سے اپنی بات کا آغاز کرتا ہوں کہ اُسی نے تو قلم کے ذریعے مجھے بھی علم سکھایا۔ وہی تو ہے جس کی مرضی سے میں نے قرطاس و قلم اٹھایا اور سیاہی کے خلاف، سفیدی کی حمایت میں اپنے جذبات لکھتا چلا گیا۔

اور آج جبکہ میں ''بلیک اینڈ وہائٹ'' عنوان سے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں روایت، ترقی پسندیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مابعد مابعد جدیدیت، تجریدیت، رمزیت اور تمثیلیت وغیرہ کی تحریکوں یا ازم سے ذرّہ برابر بھی مرعوب ہوئے بغیر اسی خالق کائنات کی بارگاہِ بے کس پناہ میں اپنے اور اپنے قلم کے سرنگوں ہونے کا اقرار کرتے ہوئے یقین رکھتا ہوں کہ.....

''وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ''

اپنی بات

خواب تو اُس کے اختیار میں ہے .... شبیر ہاشمی

ہمارے شہر مالیگاؤں نے ملک کے اردو شعر و ادب میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔ان میں دنیا جہان کے ادبی رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔شہر عزیز کا یہ فن ،صرف مالیگاؤں سے جڑا نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے برصغیر ہندو پاک کے ادبی رجحانات سے ملتے ہیں اور جب ان رجحانات سے بحث و تمحیص کی جاتی ہے تو مالیگاؤں کے شعراء و ادباء کے کارناموں کو بھی یاد کیا جاتا ہے۔یہاں کے کلاسک فنکاروں میں ادیب ، مسلم ، سہیل ،وقار ،نشاط ،اطہر ، عتیق ،ملک کے اہم شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔اسی طرح نثر نگاروں میں سلطان سبحانی ،سلیم شہزاد ،الیاس صدیقی ،اشفاق انجم ،احمد عثمانی ،ہارون فراز اور اسحٰق خضر وغیرہ کے نام ادبی مباحث میں سنائی دیتے ہیں۔

یہاں اردو نثر میں صنف افسانہ کے سفر کا آغاز ۲۰ ء کی دہائی سے ہوتا ہے۔اس سے قبل اگر کچھ افسانے لکھے بھی گئے تو وہ لائق اعتنا نہیں رہے۔اس صنف کو سلطان سبحانی ، احمد عثمانی ،عرفان عارف ، مجید انور ، خیال انصاری اور سجاد عزیز جیسے معتبر فنکاروں نے وقار بخشا اور ملک بھر کے مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں اور ان کتابوں نے ناقدین فن کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔یہ افسانہ نگار افسانے کی روایت اور اس کے نئے نئے رجحانات سے متاثر تھے۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں زندگی اور اس کے وقوعات اور مفروضات کو طرح طرح سے موضوع بنا کر اپنی عصری حسیت اور اپنے عصر سے گہری وابستگی کا ثبوت مہیا کیا۔ان کے افسانوں میں روایت کے شعور کے ساتھ تجربات کا رنگ بھی شامل ہے۔

مالیگاؤں میں صنف افسانہ میں نئے فنکاروں کا قافلہ ، جو دشتِ ادب میں اپنی آواز کی شناخت اور اپنے وجود کی دریافت کی سخت ، کٹھن اور صبر آزما منزلوں سے گزر رہا ہے اسی قافلے کے ایک راہی کا نام ہے طاہر انجم صدیقی......

طاہر انجم کے ذہنی و فکری و تہذیبی مزاج کی تعمیر ،صحت مند ،صالح روایت کے زیر اثر ہوئی ہے۔اسی لئے وہ افسانے کے موضوعات ،زبان و بیان اور لفظیات کی سطح پر صالح روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی دنیا اور بدلتی ہوئے منظر ناموں کی متحرک تصویریں نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان تصویروں میں ہمارے عہد کے سارے تضادات ،سارے دکھ ،ناآسودگیاں ،شام کی گہری اداسی کی طرح دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔طاہر انجم کے افسانوں کی زبان و بیان کی سادگی اپنا ایک الگ نظام رکھتی ہے۔جس کی وجہ سے قاری کہانی کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔افسانوں میں روایتی کردار نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار ،

افسانے کی مجموعی فضا سے قاری کے ذہن کو زندگی اور انسانوں کے بارے میں نئے زاویوں سے سوچنے اور سمجھنے کی روشنی عطا کرتا ہے۔

''بلیک اینڈ وہائٹ'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ نام بھی اپنی معنویت میں افسانہ نگار کے ذہنی و فکری رویوں کا غماز ہے۔ کتاب میں شامل افسانوں میں ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل میں شامل ہوتی بربریت (لائن آف کنٹرول)، فرد کی بزدلی اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار (ذکر اس پری وش کا)، افلاس (کیری بیگ)، فرقہ وارانہ منافرت (دوسرا تیر، راستہ، بلیک اینڈ وہائٹ، ابلیس اعظم)، خودفریبی (بگولوں کے درمیان)، مسلکوں سے بیزاری (روشنی کی تلاش)، فسطائیت کے خلاف کمزور مزاحمت (بند دروازہ)، فرد کا منافقانہ رویہ (اولڈ از گولڈ)، انسانی خون کی حرمت (چراغ) کو افسانہ نگار نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا ایجاز و اختصار ہے۔ زبان و بیان سادہ اور برجستہ ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے عہد کے مسائل سے باخبر اور گردوپیش میں ہونے والی تبدیلیوں کا شعور رکھتا ہے۔

طاہرا نجم عصر حاضر کے نت نئے انکشافات، تجربات، حوادث اور واقعات سے موضوع تلاش کرتے ہیں اور اسے محض ایک اخباری رپورٹ بننے سے پہلے موضوع کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو تازگی عطا کرتے ہیں جو کسی کہانی کا حق ہے۔

''بند دروازہ'' نظیرہ شیخ کی کہانی کو افسانہ نگار نے پُر تاثر افسانوی اظہار عطا کیا ہے۔ اس افسانے میں بدلتے بیانات کی مجبوری، حالات کی ستم ظریفی، فرد کی مکارانہ چالوں کیسامنے بے بس ہوتی ہوئی ایک مظلوم لڑکی کی کہانی جو بے بسی اور پچھتاوے کے شدید احساس پر منتج ہو کر اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ کہانی کا راوی غائب ہے اور وہ ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو اس پر نہیں گزرتے لیکن کہانی کا بیانیہ اتنا چست ہے اور افسانہ نگار کی گرفت کہانی پر اتنی مضبوط ہے کہ بہت دیر تک قاری افسانے کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ یہ افسانہ ملک میں بڑھتی ہوئی فسطائیت کو نمایاں کرتا ہے اور ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے کھڑا کرتا ہے کہ ہزار طرح کے خوف و دہشت کے ماحول میں ظلم و جبر کے خلاف ایک عام شخص آخر کتنی دیر مزاحمت کر سکتا ہے؟

''درندے'' سیاسی بازیگروں کے بے رحمانہ طرز عمل اور ان کی ابن الوقتی اور عیاریوں کی کہانی ہے۔ کہانی میں کہیں راوی غائب ہے اور کہیں خودکلامی کے انداز میں کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس میں بیانیہ کے معروضی اظہار کی جگہ تاثرات، حافظے میں محفوظ منتشر یادوں اور علامتی اشاروں نے لے لی ہے۔ اس میں انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی کے عذاب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے میں برتی گئی علامتیں بے گانہ اور مجرد نہیں ہیں۔ اسی لئے کہانی کی تفہیم ہو جاتی ہے۔

''روشنی کی تلاش'' اس افسانے میں ائمہ اربعہ کے ماننے والوں کی تنگ دلی، کم نظری اور امت کے انتشار کو

موضوع بنایا گیا ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلکوں کو مضبوط بنانے میں کامیابی نہیں ہے بلکہ کامیابی تو وحدت کے تصور میں ہے۔ کہانی کا علامتی اور استعاراتی انداز بیان، کچھ ڈرامائی اور کچھ پُر اسرار ہونے کے سبب کہانی میں دلچسپی کو برقرار تو ضرور رکھتا ہے لیکن کہانی کی کرافٹنگ اور مصنوعیت کو مکمل طور پر زائل نہیں کر پاتا۔ اسی لئے کہانی اپنے فطری بہاؤ سے محروم ہے۔ یہ اندھیرے سے روشنی کی طرف لوٹنے کی کہانی ہے۔

''اندر اترتی تاریکی'' بستی میں نفرتوں اور عداوتوں کے انتہائی پر آشوب ماحول میں ایک پاکیزہ روح گھپ اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی ہے۔ اس کی بے چینی، بے قراری، بے بسی اور دردمندانہ جذبات کو افسانہ نگار نے نہایت خوبی کے ساتھ قاری تک منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نیک نفس اندھیرے میں پھڑ پھڑاتی ہوئی ابابیل کی طرح ہے جسے ماحول کے بدلنے کا انتظار ہے۔ ''جہانِ مظلوم خواب دیگر کا منتظر ہے۔''

اسی طرح ''لائن آف کنٹرول'' ایک پُر تاثر افسانہ ہے۔ ''بائیں طرف کا منظر''، ''ہندوستانی''، ''خوف''، ''پاگو''، ''پلانے''، ''آخری آدم زاد'' ''باپو کا کا''، ''بلیک اینڈ وہائٹ'' ان افسانوں میں فرد اور معاشرے کے درمیان ایک بامعنی رشتے کی تلاش افسانہ نگار کے تخلیقی عمل کا حاصل ہے۔ خون خرابے، فتنہ و فساد اور نفرتوں کے ماحول میں دل کی اس روشنی کو افسانہ نگار نے شعوری طور پر بچانے کی کوشش کی ہے جس کی تلاش میں انسان ساری عمر سرگرداں رہتا ہے۔ ان کہانیوں میں جذبے اور احساس کی شدت کے ساتھ ایک گہری معنویت بھی ملتی ہے۔ ایک ایسی معنویت جو نئی فضا کی تخلیق کرتی ہے۔ اس نئی فضا کی تخلیق میں خود طاہر انجم ایک مدت تک تپتی ہوئی دھوپ میں چلتے رہے ہیں۔

یہ سارے افسانے، جو معاشرے اور سماج میں اخلاق اور اقدار کے فروغ کے جذبے کے ساتھ لکھے گئے ہیں، طاہر انجم کو ایک باضمیر، خوددار اور خود شناس ادیب کی حیثیت سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ طاہر کا دل روشن ہے۔ مہربان ہے اور محبت سے معمور ہے۔ ان لوگوں کے لئے بھی جو اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اس کے ایک ایک طرز ادا سے محبت پھوٹتی ہے۔ اسے اپنی مٹی سے، اپنی ثقافت سے اور اپنی سرزمین سے محبت ہے۔ اسے لہو کی حرمت کا پاس ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لئے بصیرتوں اور بصارتوں کے چراغ روشن کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ ہر نوع کے ظلم کے خلاف بیداری پیدا کرنے کا آرزومند ہے۔ اسے یقین ہے کہ..... صبح ضرور آئے گی اور یہ عہد ستم نہیں رہے گا اور کوئی دامن نم نہیں رہے گا۔

''دشت جاں'' میں اترتی ہوئی رات کے خلاف نبرد آزما یہ حرف حق کا شیدائی جانتا ہے کہ.....

''رات پر اس کا بس چلے نہ چلے خواب تو اس کے اختیار میں ہے''

□□

بلیک اینڈ وہائٹ کے درمیان ——— ڈاکٹر اقبال برکی

گذشتہ چند برسوں میں جن چند افسانہ نگاروں نے اپنی ادبی پہچان بنائی ہے، ان میں طاہر انجم صدیقی کا نام سب سے نمایاں ہے۔

طاہر کا وژن ابھی ارتقائی مراحل میں ہے اور وسعت کا متقاضی ہے۔ وہ ابھی اس منزل کے راہ رو ہیں جہاں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد فنکار بہت معمولی موضوعات پر بھی بڑے اور اعلیٰ افسانوں کی اساس رکھ دیتا ہے اور تنوع کی قوس قزح اس کے فن پارے کو دلکش و دل پذیر بنا دیتی ہے۔

وہ روزمرہ کی سیاسی، سماجی، لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت کی کوکھ سے جنم لینے والی تحریکات سے اپنے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور ان سے ہی اپنے فن کی تیکنک کا اکتساب بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے بے ساختہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم بار دگر پھر وہی خبریں پڑھ رہے ہیں جو ایک مخصوص زمانے میں میڈیا پر غالب رہی تھیں مگر اس مرتبہ ان خبروں میں پوشیدہ ان ظالم افراد یا جماعتوں کا چہرہ بہت صاف دکھائی دینے لگتا ہے جو طاقت اور کثرت کے زعم میں اپنی چیرہ دستیوں سے ظلم و جبر کی نئی تاریخ رقم کرتے چلے جاتے ہیں نیز ان معصوم افراد اور جماعتوں کی رونمائی بھی ممکن ہو جاتی ہے جو فریاد بہ لب مظلومی و بے بسی کے حصار میں محصور ہوتے ہیں اور جن کے اردگرد ان افسانوں کی المناک لیکن لہو کی روانی میں تموج پیدا کرنے والی فضا قائم رہتی ہے۔ صحافت کی ردائے بوسیدہ سے ادب کی خلعت فاخرہ کی صنعت گری کا ہنر طاہر کو خوب آتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''بلیک اینڈ وہائٹ'' ایک چیخ ہے جو اولین سطور سے گزرتی ہوئی آخری سطور تک پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے قاری کے ذہن میں منتقل ہو کر صدائے بازگشت پیدا کرتی ہے۔

یہ چیخ ظلم کے خلاف ہے۔ یہ چیخ ظالم کے خلاف صدائے احتجاج ہے، یہ حق اور آزادی کی چیخ ہے۔ مظلوم و بے بس انسانوں کی چیخ ہے۔ جھلائے ہوئے انسانوں اور دل گرفتہ مصنف کی چیخ ہے اور ایک پُر امن اور پُر سکون معاشرے کی تشکیل کی حسرت کے ماروں کی چیخ ہے۔ ان چیخوں کے مابین تراشے گئے، گو خام سہی، مگر ایسے کردار بھی موجود ہیں جو قاری کے دل و دماغ میں کسک بن کر عرصے تک زندہ و جاوید رہیں گے۔ ان کرداروں میں ''باپو کاکا'' اور ''پاگو'' کا نام بلا تکلف و بلا تردد لیا جا سکتا ہے۔

طاہر کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور اس فنکار سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ ایک نہ ایک دن ماہ کامل بن کر ضرور چمکے گا۔

□□

بجھے لفظوں کو اُجالنے والا

حمید شیخ

جدید ہو یا قدیم افسانہ اپنے تکنیکی اصولوں کی وجہ سے صاف پہچانا جاسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو ادب اور زبان میں محاورات و استعارات کی کلاسیکی روایات سے انحراف کر کے پلاٹ، کردار اور واقعات سے دامن چھڑا کر بھی جدید افسانہ اپنی علیحدہ شناخت نہیں بنا سکا، باوجود اسکے افسانہ اپنی نئی پرانی کسی بھی شکل میں موجود ضرور ہے۔

گذشتہ دہوں میں افسانہ نگاری نے اپنے نئے طرز تحریر کے جو نئے زاویے دریافت کئے ہیں، جو نئی تکنیک ایجاد کی ہے اور ان کے سائے میں جو تخلیقات ہمارے سامنے آتی ہیں، ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کی تہہ اور مفاہیم تک پہنچنا ہر قاری کیلئے آسان نہیں۔ بعض ایسے افسانے بھی ہوتے ہیں جن کے اختتام پر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے۔

افسانوں میں اب واقعہ، کردار، کہانی، مکالمہ، محاورہ، استعارہ وغیرہ کچھ بھی اہم نہیں ہے۔ اہم صرف تکنیک ہے اور اس تکنیک کے ذریعے اپنا خیال، اپنی فکر، اپنا فلسفہ بلا تحقیق و تجزیہ بلا تامل بے ربط و بے خوف ہو کر بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طاہر انجم جو کہنا چاہتا ہے، بہت واضح طور پر، بڑے فنکارانہ انداز میں کہہ جاتا ہے۔ وہ ایسے افسانے نہیں لکھتا جس کے کردار اپنی نفسیات کی بھول بھلیوں میں کھو جائیں یا جنہیں سمجھانے کے لئے مزید شرح لکھنی پڑے۔ شستہ لہجہ و بیان کی روانی، خوامخواہ کی فلسفیانہ دبازت سے بوجھل نہیں ہوتی بلکہ اس کے افسانوں میں زندگی کی آویزش کا ادراک آرٹ کا افسوں جگاتا ہے۔

طاہر انجم کا ماحول ایسا ہے کہ جہاں لوگ نامساعد حالات میں بھی بے رحم زندگی کی آسودگی کشید کر لیتے ہیں۔ اس لئے طاہر انجم اپنے افسانوں میں ہر طرح کے احساس و عمل کو پیش کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ افسانہ کے اسلوب و آہنگ کو حسن آفرین میڈیم میں ڈھالنے کا ہنر سیکھ گیا ہے۔ وہ سوز دروں سے بجھے لفظوں کو اجال دیتا ہے۔ ''عید گزیدہ'' اس ضمن کی بہترین مثال ہے۔ ''بند دروازہ'' انسان کے اندرون میں ہوتی شکست و ریخت کو قاری کے احساس تک پہنچاتا ہے اور ''پلانے'' انسان کی بے ضمیری پر انگلی رکھ دیتا ہے۔

طاہر انجم اپنے افسانوں میں تمام تر فنی احساسات کے ساتھ جاگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

افسانہ نویسی ہنر ہے اور افسانہ نگاری فن ہے۔ جیسے پھولوں سے خوشبو کشید کرنا عطاری ہے، ہنر ہے اور زندگی کے تر دامن سے خوشبو نچوڑ لینا فن ہے اور طاہر انجم کے ہاں فن اپنی جولانیوں کیساتھ اپنے چکنے چکنے پات دکھاتا ہے

طاہر انجم اپنا پہلا مجموعہ ''بلیک اینڈ وہائٹ'' لے کر حاضر ہیں۔ سنجیدہ اہل قلم اور افسانوی ادب کے قدر شناس ان کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ طاہر انجم کی شناخت کو معتبر کر دے گا۔ □□

آخری آدم زاد

میں صدیوں سے آدم زاد کی تلاش میں تھی..... میں نے اسے بہت ڈھونڈا..... بہت تلاش کیا..... صبح کی دھندلی چادر سے اس کا پتہ پوچھا..... دوپہر کے آگ اگلتے سورج سے دریافت کیا..... شام کی سرمئی رنگت سے استفسار کیا..... رات کی تاریکی سے سوال کیا..... چاند اور ستاروں سے معلوم کرنا چاہا..... مگر..... کسی نے بھی مجھے آدم زاد کا پتہ نہیں بتایا۔

میں آدم زاد کی تلاش میں ان بستیوں کی طرف گئی جہاں وہ بستا تھا..... مگر وہاں ہر طرف تباہی کا تسلط نظر آیا..... بربادی کا مکروہ چہرہ دکھائی دیا..... آدم زاد کی بلند و بالا عمارتیں زمین پر بکھری پڑی نظر آئیں..... زمین پر میزائیل اور بموں کے گرنے سے ہو جانے والے گڑھے جا بجا دکھائی دیئے..... آدم زاد کی جنت نشان بستیاں کھنڈر بنی دکھائی دیں اور وہاں فضا میں بارود کی بو رچی بسی محسوس ہوئی..... میں نے زمین پر بکھری پڑی عمارتوں سے..... زمین پر پڑ جانے والے گہرے گڑھوں سے..... کھنڈرات سے..... اور ان سبھوں پر چھائی ہوئی منحوس بارودی فضا سے آدم زاد کا پتہ پوچھا..... سب خاموش رہے.. بارودی فضا مسکرادی..... اس کی منحوس مسکراہٹ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ جہاں وہ پھیل جاتی ہے..... وہاں سے آدم زاد کا نام و نشان مٹا دیتی ہے۔

میں افسردہ ہو کر آگے بڑھ گئی..... میرے راستے میں کئی بحرِ اعظم آئے۔ میں نے ان سے آدم زاد کا پتہ پوچھا..... کئی بحرِ اعظم ملے۔ ان سے دریافت کیا..... کئی دریا دکھائی دیئے۔ ان سے سوال کیا..... کتنے ہی ریگستان ملے..... برفاب چوٹیاں ملیں..... اونچے پہاڑ نظر آئے..... ہری بھری وادیاں دکھائی دیں..... جنگل نظر آئے۔ میں نے سبھوں سے آدم زاد کے متعلق پوچھا..... مگر بحرِ اعظم خاموش رہے..... سمندروں کا سکوت برقرار رہا..... دریاؤں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے..... ریگستان چپ رہے..... برفاب چوٹیوں نے سرد آہ بھری..... اونچے پہاڑ خاموش بت بنے کھڑے رہے..... ہری بھری وادیوں نے افسوس سے سر جھکا لیا..... اور..... جنگلوں نے نفی میں سر ہلا دیا..... کہ..... انہوں نے بھی صدیوں سے آدم

زاد کو نہیں دیکھا ہے..... نہ جانے سارے کے سارے آدم زاد کہاں کھو گئے تھے؟..... نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے بھی؟.....

میں آدم زاد کی تلاش میں تھکن سے چور چور ہو چکی تھی..... پھر بھی اپنے دل میں ایک موہوم سی امید لئے ایک ہرے بھرے درخت کے پاس گئی اور اس سے پوچھا.....

''بھائی..... !آپ نے آدم زاد کو ادھر کہیں دیکھا ہے؟''

''آں! کیا؟ آدم زاد؟ ہاں! ہاں!..... دیکھا ہے..... ابھی تھوڑی ہی دیر قبل ایک آدم زاد یہاں آیا تھا..... جو بہت ہی دنوں بعد دکھائی دیا تھا..... کچھ دیر بیٹھ کر اس نے میرے سائے میں آرام کیا تھا..... اور ہاں..... اس دوران وہ خود اپنے آپ سے باتیں بھی کر رہا تھا..... اور اس کی خود کلامی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ..... اِن..... سا..... نی..... ہاں انسانیت نامی کسی چیز کی تلاش میں تھا..... دردر کی خا.....''

''کیا؟..... کیا کہا آپ نے.....؟؟..... انسانیت کی تلاش میں تھا وہ؟؟..... کدھر گیا وہ؟..... کس طرف گیا ہے وہ آدم زاد؟؟..... میں ہی انسانیت ہوں، اسے میری ہی تلاش ہے..... کدھر گیا وہ؟..... اس سے بچھڑے مجھے صدیاں بیت چکی ہیں..... آپ جلدی بتا دیں..... کس طرف گیا ہے وہ؟..... کدھر گیا ہے وہ آدم زاد؟؟..... جلدی بتایئے نا..... بڑی مہربانی ہوگی آپ کی.....''

میری باتیں سن کر اس درخت نے بڑی غمزدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پُر رحم لہجے میں بولا.....

''وہ آدم زاد..... جنگل کی طرف گیا ہے..... مغرب کے خوفناک جنگل کی طرف.....''

اتنا سنتے ہی میں اپنی ساری تھکن بھول کر مغرب کے خوفناک جنگل کی طرف دوڑ پڑی..... بھاگتی رہی..... ہانپتی رہی..... دوڑتی رہی..... آدم زاد کو آوازیں دیتی رہی..... مگر وہ مجھے نظر نہ آیا اور میں دوڑتی رہی..... مغرب کے خوفناک جنگل کی طرف.....

غروب ہوتے سورج کی زرد روشنی میں مَیں جنگل کے قریب پہنچی..... ایک آدم زاد مجھے دکھائی دیا..... ''میری محنت رنگ لائی''..... میں یہ سوچ کر خوش ہو گئی..... مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے..... یقیناً وہ میری ہی تلاش میں تھا..... میں نے اسے آواز دی۔

ایک آواز..... دو..... تین..... اور پھر آواز پہ آواز دیتی رہی..... مگر بہت دیر ہو چکی تھی..... غروب ہوتے سورج کی اُداس کرنوں کے حصار میں..... خود مجھے..... اپنی ہی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی..... کیونکہ پورا جنگل مختلف جانداروں کی آوازوں کے شور سے گونج رہا تھا..... اور وہ آدم زاد..... جس کی مجھے تلاش تھی..... وہ خود میری تلاش میں..... مغرب کے اس خوفناک جنگل میں داخل ہو گیا..... اور میں آنسو بہاتی اس جنگل کا شور سنتی خاموش کھڑی رہی.....

□□

عید گزیدہ

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے ایسا لگتا تھا کہ ہم چار ہی ہیں۔ حالانکہ ہم پانچ لوگ تھے۔ رامو پرساد، کرتار سنگھ، فرنانڈیز، میں اور وہ مگر اس کی گنتی کون کرے؟ عجیب قیدی تھا وہ نہ کسی کے لینے میں رہتا اور نہ کسی کے دینے میں بس اپنی دنیا میں مگن رہتا مگر اس کی دنیا ہی کیا تھی؟ چھوٹی سی کوٹھری جس میں ہم چاروں بھی قید تھے ہماری دنیا بھی وہی کوٹھری تھی مگر ہمیں اپنا احساس بھی تھا ایک دوسرے کے وجود کا احساس تھا اس کوٹھری کی خستہ حالی کا احساس تھا جس کی دیواروں پر پلاسٹر نام کی کوئی چیز کبھی رہی ہوگی چھت مکمل طور پر سیاہ تھی شاید کالے کرتوت والوں کے سر چھپاتے چھپاتے خود بھی سیاہ پڑ گئی تھی دیواروں کے نچلے سروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہاں کبھی سنگی فرش بھی رہا ہوگا مگر اس وقت اوبڑ کھابڑ زمین ہی ہمارا فرش تھی لیکن وہ عجیب آدمی تھا ان ساری باتوں سے بے نیاز بلکہ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ آدمی ہی نہیں ہے ہم لوگ وقت گذاری کیلئے باتیں کرتے دیواروں پر تبصرے کرتے کوٹھری کی اوبڑ کھابڑ زمین پر باتیں کرتے ایک دوسرے کے حالات سنتے سناتے اور بہت ساری باتیں کرتے مگر وہ ہم چاروں سے بے تعلق خاموش بیٹھا رہتا نہ اسے مچھروں سے شکایت تھی نہ کھٹملوں کا گلہ نہ مکھیوں سے شکوہ تھا اور نہ ہی ہم چاروں سے کوئی شکایت بس ہم لوگوں کو ہی اس سے شکایت رہتی تھی کچھ بھی تو نہیں بولتا تھا وہ خاموش خاموش اُداس اُداس سنجیدہ سا رہتا تھا اپنے تعلق سے ایک لفظ بھی تو نہیں بتایا تھا اس نے حالانکہ اسے اس کوٹھری میں آئے ایک ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا مگر اس دوران اُس نے ہم لوگوں سے ایک بات بھی تو نہیں کی تھی سبھی کھانا لاتے وہ خاموشی سے کھاتا اور ایک کونے میں جا بیٹھتا اگرچہ کہ اس نے اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا لیکن اس کی کہانی ہمیں پہریداروں کی زبانی

معلوم پڑی تو ہمیں بہت حیرت ہوئی تھی..... اس کا نام شاہد خان تھا..... وہ فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا..... اس کا گھر ایک ایسے گاؤں میں تھا جہاں ان کے علاوہ تمام کے تمام ہی ہندو گھرانے آباد تھے ..... پھر بھی وہ اس کے گھر والوں کی بہت عزت کیا کرتے تھے..... اس کے خاندان والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتے تھے..... گذشتہ عید پر اپنے گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لئے وہ ٹھیک عید ہی کے دن اپنے گاؤں آیا تو اپنے گھر کی جگہ جلے ہوئے ملبے کا ڈھیر اسے دکھائی دیا..... کیونکہ عید سے دو روز قبل اس گاؤں سے بالکل قریب موجود شہر میں ہوئے ہندو مسلم فساد کی وجہ سے طیش میں آ کر گاؤں والوں نے گھر سمیت اس کے پورے ہی خاندان کو زندہ جلا دیا تھا..... اس کے والد..... دو بھائی..... ایک بہن..... بیوی اور ایک پیاری سی بچی ..... سب جل گئے تھے..... صرف اس کی والدہ زندہ بچی تھی..... اور اس نے اسپتال میں اپنی آخری سانسوں کے دوران اسے بتایا تھا کہ اس گاؤں کے لوگوں نے ہی ان کے گھر میں آگ لگائی تھی۔ حالانکہ اس نے ان لوگوں کو یاد بھی دلایا تھا کہ شاہد خان اس کا بیٹا ہے..... اور فوج میں کرنل ہے..... وہ سرحد پر رہ کر ملک کی حفاظت کر رہا ہے ..... لیکن ان لوگوں نے اسے جواب دیا تھا کہ حفاظت تو کتے بھی کرتے ہیں..... اور اتنا کہہ کر ان لوگوں نے ان کے گھر کو آگ لگا دی تھی..... اس کے پورے خاندان کو عید سے دو روز قبل ہی زندہ جلا دیا تھا..... اتنا سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا..... اور گاؤں کے بیس لوگوں کو قتل کر دیا..... بہت سے گھروں کو جلا ڈالا..... اور پھر خود ہی تھانے جا کر گرفتار بھی ہو گیا..... تب سے وہ خاموش ہی رہ رہا ہے..... خاموش سزا کاٹ رہا ہے..... مجھے تو آئی ایس این نامی تنظیم کے صدر ہونے کی وجہ سے ملک مخالف سرگرمیوں کے شک میں گرفتار کیا گیا تھا..... فرنانڈیز کو وزیر خارجہ کے ساتھ مل کر ہتھیاروں کا غبن کرنے کی سزا دی گئی تھی..... رامو پرساد چارہ اسکینڈل کی سزا پوری کر رہا تھا..... اور کرتار سنگھ سابق وزیر اعظم کے قتل کی سزا کاٹ رہا تھا..... اور ساری باتیں تو ہم نے ایک دوسرے سے معلوم کی تھیں..... مگر شاہد خان کے متعلق ہمیں پہرہ داروں نے بتایا تھا..... اس نے تو ہم لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے ہمارے سامنے اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا تھا..... اور اس روز جب مجھے رہائی مل رہی تھی..... وہ عید کی چاند رات تھی..... رات دس بجے مجھے قید سے آزاد ہونا تھا..... اب نہ جانے کیا مصلحت تھی حکومت کی کہ وہ مجھے رات دس بجے ہی رہا کر رہی تھی..... اور وہ بھی عید کی چاند رات کو.....

میں فرنانڈیز..... کرتار سنگھ..... اور..... رامو پرساد سے مل چکا تھا..... رات کے دس بجنے کو تھے سپاہی دروازے پر آ چکے تھے..... مگر میں شاہد خان سے نہیں ملا تھا..... ملتا بھی کس منہ سے.....؟ اس سے

کچھ تعلق ہی نہ تھا میرا..... اس لئے میں آگے بڑھ گیا..... میں نے کوٹھری کے کھلے دروازے کی طرف اپنے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک نئی آواز نے میرے بڑھتے قدم روک دیئے .....

''طاہر بھائی..... !ذرا رُکیے.....''

میں رک کر پیچھے مڑا..... شاہد خان میرے سامنے کھڑا تھا..... رامو پرساد، فرنانڈیز اور کرتار سنگھ کے ساتھ ساتھ میں بھی اسے حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ تقریباً دوڑتا ہوا آیا اور میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... روتا رہا..... روتا ہی چلا گیا..... اور روتے روتے کہتا رہا۔

''عید مبارک طاہر بھائی!..... عید مبارک..... عید مبارک..... عید مبارک.....''

عجیب سی پچویشن تھی وہ..... وہ روتا ہی چلا جا رہا تھا..... میں بھی رونے لگا تھا..... وہ مجھے عید مبارک کہہ رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں.....؟ میری حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ میں بھی روئے چلا جا رہا تھا..... روتے روتے ہم دونوں کی ہچکیاں سی بندھ گئی تھیں ..... اور میں نے اپنی بھیگی پلکوں کے درمیان سے فرنانڈیز..... رامو پرساد..... اور کرتار سنگھ کو آنسو پونچھتے دیکھا تھا..... حالانکہ ہم اتنے دنوں تک ایک ساتھ رہے تھے..... اور شاہد خان ہم لوگوں سے قطعاً بے تعلق رہا تھا..... اس کا اور ہمارا کوئی بھی تو ربط نہیں تھا..... کوئی بھی رشتہ نہیں تھا ہمارے درمیان..... پھر بھی اس وقت ہم سب رو رہے تھے..... نہ جانے کس ڈور نے ہمیں آپس میں باندھ دیا تھا..... کہ ہم پانچوں ہی روئے چلے جا رہے تھے..... روئے چلے جا رہے تھے..... روتے ہی چلے جا رہے تھے۔ □□

بائیں طرف کا منظر

جنگل کے بہت سارے درختوں کی طرح آم کا وہ درخت بھی تناور ہی تھا لیکن تیز ہوا چلی تو اس کا پورا وجود ہل گیا۔ اس نے گھبرا کر اپنی جڑوں سے زمین کو جکڑ لیا حالانکہ اَن گنت بار اس نے شدید طوفانی ہواؤں کا وار اپنے سینے پر روکا تھا۔ سینکڑوں مرتبہ آندھیوں نے اس کے وجود پر زور آزمائی کی مگر انہیں ہر مرتبہ اپنا سامنہ لے کر چپ چاپ آگے بڑھنا پڑا اور وہ سینہ تانے فخر سے سر اونچا کئے شکست خوردہ آندھیوں کو منہ لٹکائے جاتے دیکھا کرتا مگر..... اب تو ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی وہ لرز اٹھتا تھا۔ تیز ہوا جب بھی چلتی..... اسے اپنے پیر اکھڑتے محسوس ہوتے..... اور وہ گھبرا کر اپنی جڑوں سے زمین کو جکڑ لیتا۔

اس کی شاخ سے جب پہلا پتہ ٹوٹا تھا..... اس نے کوئی دھیان نہیں دیا تھا..... دوسرا پتہ گرا..... اس نے کچھ نہیں سوچا..... تیسرا پتہ جب اس کے جسم سے جدا ہوا تب بھی اسے کوئی فکر نہیں ہوئی لیکن ایک روز جب مشرق سے اٹھنے والی سنہری تھال نے تاریک آسمان کو نیلگوں بنایا تو اس نے نیچے دیکھا اور سرتاپا لرز اٹھا..... نیچے اس کے مضبوط اور تناور وجود کے بے شمار ٹکڑے زرد پتوں کی صورت میں بکھرے پڑے تھے۔

ہوا کا تیز جھونکا پھر آیا..... اس نے زمین کو جکڑ لیا..... مگر..... اس کے وجود کے بہت سارے ٹکڑے زرد پتوں کے روپ میں منتشر ہو گئے..... وہ کمزوری اور نقاہت سے ہانپنے کانپنے لگا..... اور اس کی نظریں بے اختیار اپنے بائیں جانب اٹھ گئیں..... وہاں بوڑھے برگد کی سوکھی اور دیمک زدہ ہڈیاں بکھری پڑی تھیں..... جو کبھی جھوم جھوم کر خوشیوں کے گیت اسے سنایا کرتے تھے..... اسے اچھی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے..... اور زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا کرتے تھے

برگد بابا کو یاد کر کے اس کا دل مسوس اٹھا..... تیز ہوا پھر چل پڑی..... اسے اپنا وجود جڑوں سے اکھڑتا محسوس ہوا..... مگر نہ جانے کس کی دعاؤں سے ہوا تھم گئی..... اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی..... اس

کے ہونٹوں سے سرد آہ نکل پڑی..... اس کا دل خون کے آنسو رو پڑا..... اور..... اس کی نگاہیں ببول کے منحوس چہرے پر جا پڑیں..... اس کے ذہن میں بوڑھے برگد بابا کی سرگوشی گونجی۔

''دیکھ بیٹا..... تو اس کی بھولی بھالی صورت نہ دیکھ..... یہ جنگل ہے جنگل..... کون کیسا ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا..... تو اسے بڑھنے مت دے..... اسے بڑا ہونے مت دے..... ورنہ یہ.....''

''لیکن کیوں بابا؟..... یہ تو بہت ہی معصوم ہے..... بھولا بھالا..... گڈے جیسا.....''

''نہیں بیٹا! ہر معصوم صورت دل کی بھی معصوم نہیں ہوتی..... میں نے اس زمانے میں یہی دیکھا ہے..... تو اسے بڑا مت ہونے دے ورنہ یہ بڑا ہو کر تیرا سارا خون چوس لے گا..... پورا خون.....''

''یہ اور خون چوسے گا؟..... نہیں بابا کتنا بھولا ہے یہ..... نہیں خون چوسے گا یہ۔''

بوڑھے برگد نے اسے جب بھی سمجھایا..... وہ ان کی جہاندیدگی پر ہنس پڑا..... ان کی باتوں کو ہنسی میں ٹال گیا..... انہوں نے اسے لاکھ سمجھایا..... ہزار منع کیا..... مگر اسے ان کی باتوں پر یقین ہی نہیں آیا..... اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا..... جب ببول کا وہ پودا اس کی بغل تک آ پہنچا..... اور اس نے اپنے بے شمار نوکیلے دانت اس کے مضبوط تناور وجود میں گاڑ دیے.....

وہ لاکھ چیخا..... ببول کو ہزار بار منع کیا..... ہاتھ جوڑے..... منت سماجت کی..... سمجھایا..... مگر وہ نہ مانا..... اور اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کے مضبوط وجود کو چھلنی کرتا رہا..... مزہ لے لے کر اس کے تناور جسم سے خون چوستا رہا..... اندر سے اسے کھوکھلا کرتا رہا.....

تیز ہوا پھر چل پڑی..... مگر..... اب کی مرتبہ تھمی ہی نہیں..... اپنے ساتھ گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ سمیٹے چلتی رہی..... وہ جھٹکے پہ جھٹکے کھاتا رہا..... بار بار اپنے کھوکھلے وجود کو سنبھالتا رہا..... اپنی جڑوں سے زمین کو مضبوطی سے جکڑتا رہا..... مگر..... سب بے سود..... چرر کی تیز آواز کے ساتھ ہی وہ زمین پر آ رہا..... اس کی ٹہنیاں چیخ چیخ کر ٹوٹ گئیں..... اس کی جڑیں زمین سے باہر نکل پڑیں.....

اور وہ مجسم بے درد بنا ببول کی طرف دیکھنے لگا.....

وہ جھوم رہا تھا..... خوشی سے سرشار جھوم رہا تھا..... ہنس رہا تھا..... اس کی موت پر قہقہے لگا رہا تھا.....

اس نے پلکیں جھپکائیں..... آنسو کے دو قطرے اس کی آنکھوں سے نکل پڑے..... اور..... اس نے مڑ کر بڑی بیچارگی کے عالم میں اپنے بائیں طرف دیکھا..... وہاں بوڑھے برگد کی سوکھی اور دیمک زدہ ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

□□

راستہ

میں اسی سڑک پر بھاگ رہا تھا..... جو سیدھی چلی جاتی ہے..... نہ جانے کہاں جا کر اس کا انت ہوگا..... لگتا ہے..... یہ سیدھی جا کر آسمان کی سونڈی سونڈی نیلاہٹوں میں گم ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ اس کے دونوں سائیڈ کی اونچی اونچی دیواریں بھی آکاش کی بلندیوں میں کھو جائیں گی..... میں ان دیواروں کے بیچ موجود سیدھی سڑک پر ہی تو بھاگا جا رہا تھا..... حالانکہ دوڑنے سے پہلے میں بڑے پرسکون انداز میں آگے بڑھ رہا تھا..... مگر نہ جانے کہاں سے ایک جیپ میرے پیچھے چلی آئی تھی..... میں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا..... اس کی چھت پر ایک بورڈ لگا تھا..... "Commercial Journey" ..... "تجارتی سفر"۔

وہ جیپ رینگتے رینگتے میرے بالکل قریب آ گئی..... اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سرخی مائل گوری رنگت والے شخص کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا..... اس نے اپنے سر کا شکاری ہیٹ سیدھا کر کے ہاتھ باہر نکال دیا..... میں اس کے ریوالور کی زد پر تھا..... اس نے مجھے بھاگنے کو کہا تھا..... میں بھاگنے لگا..... دوڑنا میری زندگی کی شرط بن گیا..... میں رکتا..... گولی چل پڑتی..... میں اسی لئے بھاگا جا رہا تھا۔

میں راستہ بھی تو نہیں بدل سکتا تھا..... کیونکہ سڑک کے دونوں طرف کی اونچی دیواریں بھی سڑک کے ساتھ پیچھے کو بھاگی جا رہی تھیں..... میں آگے بھاگ رہا تھا..... جیپ کی آواز میرے تعاقب میں آ رہی تھی..... میری موت کا پیغام میرے کانوں تک پہنچا رہی تھی..... مگر اچانک ہی "اللہ اکبر"..... "جے بجرنگ بلی"..... کے نعرے بھی اس پیغام کے ساتھ مجھے سنائی دیئے..... اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا..... ایک فلک شگاف چیخ مجھے دہلا گئی..... چیخ سن کر میں بالکل غیر ارادی طور پر رک گیا..... مگر ریوالور کے خوف سے فوراً دوڑنے لگا..... دس بیس قدم دوڑتے دوڑتے میں نے سوچا

''میں تو رک گیا تھا..... گولی کہاں چلی تھی؟..... میرے رُکتے ہی گولی چل پڑنا تھی..... شکاری ہیٹ والے کی یہی تو شرط تھی..... کہیں اس نے خودکشی تو نہیں کر لی؟''

اتنا سوچتے ہی میرے کان جیپ کی آواز پر لگ گئے.....

جیپ کی آواز مجھے سنائی نہیں دی..... میں نے ہمت کر کے اپنی رفتار کم کر لی..... گولی نہیں چلی..... میری رفتار کم ہوئی..... تب بھی گولی کی آواز سنائی نہیں دی..... میں رک کر ہانپنے لگا..... ریوالور پھر بھی خاموش رہا..... میں نے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا..... جیپ چپ چاپ کھڑی تھی..... سرخی مائل گوری رنگت والا شخص خون میں لت پت جیپ کے قریب ہی سڑک پر پڑا ہوا تھا..... وہ کچھ کہہ رہا تھا..... اور دو نوجوان خون آلود تلواریں لئے اسے دیکھ رہے تھے.....

میں پلٹ کر ان کی طرف چل پڑا..... مگر ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گوری رنگت والے نے نہ جانے کیا کہا کہ وہ دونوں نوجوان ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے..... میں چیخا..... چلایا..... انہیں لڑنے سے منع کیا..... لڑائی سے باز رکھنا چاہا..... مگر اس سڑک کی اونچی دیواروں کے درمیان ''جے بجرنگ بلی''..... ''اللہ اکبر'' اور تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں گونجتی رہیں۔

اچانک ہی گوری رنگت والے نے اپنی بکھری طاقت یکجا کر کے تیزی سے کچھ کہا..... نوجوانوں کی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر رک گئیں..... وہ اسے دیکھنے لگے..... اس نے اپنی اُکھڑی سانسوں کے درمیان میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو نوجوانوں نے پلٹ کر مجھے گھورا..... مجھے گھورتے گھورتے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا..... آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کیا..... ان کی خون آلود گلے ملی ہوئی تلواریں الگ ہوئیں..... اور وہ دونوں بڑی تیزی سے میری طرف لپکے.....

''جے بجرنگ بلی''..... ''اللہ اکبر'' کے نعرے سیدھی سڑک کی اونچی دیواروں کے درمیان گونجے..... مگر اس مرتبہ..... ان کی تلواریں آپس میں نہیں ٹکرائیں..... نہ ہی گوری رنگت والے کی چیخ بلند ہوئی..... بلکہ میرے دونوں بازو کٹ کر سڑک پر تڑپنے لگے اور دیواروں کے درمیان میری فلک شگاف چیخ گونج اٹھی.....

میرے کٹے ہوئے ہاتھ سڑک پر گر کر تڑپنے لگے..... میرے شانوں سے خون کے سوتے پھوٹ پڑے..... میرے کپڑے اور سڑک میرے خون سے لال ہونے لگی..... اور رفتہ رفتہ بند ہونے والی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا.....

میں چکرا کر سڑک پر پھیلے اپنے ہی خون پر گر پڑا..... اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....

نہ جانے کتنا وقت گزر جانے کے بعد مجھے ہوش آیا..... میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں..... نیلا آسمان دیواروں کے بیچ سے بالکل صاف نظر آ رہا تھا..... اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں..... میں نے انہیں جھٹکنے کے لئے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھنا چاہا تو درد کی شدید ترین لہریں میرے شانوں سے اٹھ کر میرے پورے وجود میں پھیلتی چلی گئیں..... میں نے آنکھیں بند کر لیں.....

اپنے جبڑے بھینچ کر میں نے ایک سسکاری بھری..... مارے درد کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے.....

درد کی شدت میں جب کمی آئی..... تو مجھے پھر محسوس ہوا جیسے میرے بدن پر چیونٹیاں ہی رینگ رہی ہیں..... میں نے آہستہ سے سر اٹھا کر پہلے اپنے شانوں کو دیکھا..... دونوں بازو شانوں سے الگ ہو چکے تھے..... میرا اوپری بدن برہنہ تھا اور واقعی میرے بدن پر چیونٹیوں جیسے ایک ڈیڑھ انچ لمبے کیڑے ہی رینگ رہے تھے.....

ان میں سے کچھ اپنے ڈنک گڑائے میرے بدن کا خون چوس رہے تھے تو کچھ ڈنک اٹھائے ادھر ادھر پھر رہے تھے..... اور میں بے بس پڑا انہیں دیکھ رہا تھا.....

اچانک ہی مجھے ایک آواز سنائی دی.....

''دوستو..... یہ ناک جو ہے نا..... اس کی جگہ دل تھا..... دل..... آؤ..... اسے توڑ کر یہاں دل بنائیں.....''

پھر بہت ساری آوازیں سنائی دیں.....

''ہم دل بنائیں گے..... ناک توڑیں گے..... ناک توڑ کر اس کی جگہ دل بنائیں گے.....''

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی..... سڑک پر کوئی نہیں تھا..... میں نے اپنے بدن پر دیکھا..... کچھ کیڑے تیزی سے میری ناک کی طرف رینگ رہے تھے..... میں چلانے لگا..... میری ناک خطرے میں تھی..... میں چیخنے لگا..... انہیں روکنے لگا..... سوچنے لگا.....

''کاش! میرے بازو نہ کٹے ہوتے..... میں انہیں اپنے ہاتھوں سے روک کر اپنی ناک بچا لیتا''

آخر کار..... میری ناک کا وجود ان کیڑوں نے ختم کر دیا..... میں چیختا رہا چلاتا رہا..... ناک کی جگہ

صرف دو سوراخ رہ گئے..... خون میرے چہرے پر پھیلنے لگا..... اور میری ناک توڑنے والے کیڑے وہاں دل بنانے کی بات کرنے لگے..... میرے بدن پر موجود دوسرے کیڑوں نے دل بنانے اور ناک توڑنے کے خلاف احتجاج کیا..... ناک توڑنے والے کیڑے بضد رہے..... اور احتجاج کرنے والوں پر ٹوٹ پڑے.....

کیڑے آپس میں لڑنے لگے.....

"جے بجرنگ بلی....."

"اللہ اکبر....."

..... کے نعرے لگانے لگے..... ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے..... ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے..... مگر..... خون میری رگوں سے کم ہونے لگا..... وہ آپس میں لڑتے رہے..... خون میرا کم ہوتا رہا..... لڑائی جاری رہی..... خون میرا کم ہوتا رہا..... مگر کچھ کیڑے اس لڑائی سے دور کھڑے..... ان لڑنے والے کیڑوں کو منع کر رہے تھے لڑائی سے..... جنہیں دیکھ کر میری رگوں میں خون بڑھ رہا تھا..... لڑائی جاری تھی.....

میں بے بسی سے پڑا تھا..... موت دبے قدموں میری جانب بڑھ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا..... اب تو مجھے اور تیزی سے دوڑنا ہوگا..... اس سڑک پر جس کے دونوں طرف اونچی دیواریں میری بے بسی پر ہنسیں گی..... کیونکہ اب میرے تعاقب میں گوری رنگت والے کی جیپ نہیں ہوگی..... جیپ کی آواز نہیں ہوگی..... موت کے بے آواز قدم ہوں گے..... اپنی زندگی کے لئے مجھے پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے بھاگنا پڑے گا مگر میں بھاگوں گا کس طرح؟..... موت سے اپنا فاصلہ کیسے بڑھاؤں گا؟..... کہ اب تو میرے جسم کا آدھے سے زیادہ خون ختم ہو چکا ہے نہ جانے اور کتنا خون کم ہو؟..... پھر..... میرے دونوں ہاتھ بھی تو کٹ چکے ہیں..... ایک مشرق میں پڑا ہے تو دوسرا مغرب میں..... میرے چہرے سے ناک کا وجود ختم ہو گیا ہے اور میں اس سیدھی سڑک پر پڑا ہوں.....

تب سے بے بس ہو کر میں اس سیدھی سڑک پر پڑا ہوں۔ جسے دیکھنے پر لگتا ہے کہ یہ اپنی دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ سیدھے جا کر آسمان کی نیلاہٹوں میں کھو جائے گی..... میں سڑک پر پڑا ان دیواروں کے درمیان سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھا کرتا ہوں کہ..... شاید اُدھر ہی سے میری زندگی کی کوئی راہ دکھا دی جائے..... موت سے بچنے کا کوئی راستہ نکال دیا جائے.....

□□

کیری بیگ

وہ بھاگا جا رہا تھا۔ دوا کی کیری بیگ اس کے حمالی کرنے والے مضبوط ہاتھ میں تھی..... اس کا چار سالہ اکلوتا بیٹا تین روز سے شدید بخار میں تپ رہا تھا..... مگر ایک ہفتے سے جاری دنگے فساد نے اس کے گھر کے ڈبے تک خالی کر دیئے تھے..... بڑا سخت کرفیو لگا دیا گیا تھا..... وہ اور اس کی بیوی دو روز سے سوکھی روٹی کھا کر پانی پی کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا رہے تھے..... مگر جب بچے کا بخار بہت شدت اختیار کر گیا..... تو اسے لیکر وہ دونوں اپنے محلے کے ڈاکٹر کے گھر جا پہنچے..... اسے بچے کی حالت بتائی..... اپنی خالی جیب بھی دکھائی..... بیچارے اس ڈاکٹر نے بچے اور ان پر رحم کھا کر بغیر روپے لئے اس کی دوا دے دی..... ایک انجکشن بھی اپنے پاس سے لگا دیا..... اور ایک چٹ پر کچھ دوائیاں لکھ کر انہیں ہدایت دی۔

''دیکھو! بچے کی حالت بہت خراب ہے..... کیسے بھی کر کے یہ دوا لا کر اسے ضرور پلا دیں..... تین کیپسول اور چھ گولیاں ہیں..... اس کے پینے سے اوپر والے نے چاہا تو تمہارا بچہ ضرور اچھا ہو جائے گا.....''

چٹ ڈاکٹر کے ہاتھوں سے لے کر اس نے اپنے بیوی کا منہ دیکھا اور پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے بیوی کے ہمراہ اپنے گھر کی طرف چل دیا..... راستے بھر دونوں خاموش رہے۔

گھر جا کر ڈاکٹر کی دی گئی دوا بچے کو پلائی اور اسے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی کوشش کے دوران ان کے کانوں سے ایک اعلان کی آواز ٹکرائی۔

''محکمۂ پولس کی جانب سے کرفیو میں ایک گھنٹے کی چھوٹ کا اعلان کیا جا رہا ہے..... آپ لوگ اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کر لیں..... ٹھیک ایک گھنٹے بعد کرفیو دوبارہ نافذ کر دیا جائے گا..... ایک ہی گھنٹے کی چھوٹ ہے کرفیو میں.....''

''میں آتا ہوں ان دواؤں کا کچھ انتظام کر کے.....''

اس نے اپنے ہاتھ میں تھمی چٹ بیوی کو بتا کر شرٹ کی جیب میں ٹھونسی ..... اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا ..... خالی خالی پیٹ میں مٹکے کے پانی کی ٹھنڈک سے اسے کچھ راحت ملی اور وہ اپنی کئی جگہوں سے سلی ہوئی چپل پہن کر اپنے ٹوٹے پھوٹے خستہ حال جھونپڑے سے باہر نکلا ..... اس کے قدم اپنے آس پاس کے محلوں سے آگے بڑھتے رہے۔

ایک جگہ اُسے ایک میڈیکل اسٹور کھلا نظر آیا ..... دو تین افراد دوا لینے کیلئے کھڑے بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہے تھے ..... اس نے میڈیکل کے کاؤنٹر پر اپنی جیب سے ڈاکٹر کی لکھی گئی چٹ نکال کر رکھی ..... میڈیکل کی گھڑی پر اس کی نظر جا پڑی۔ کرفیو ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا .....

میڈیکل والے نے چٹ اور دوائیاں ایک سیاہ کیری بیگ میں رکھ کر اس کی طرف سرکائی اور بولا۔

''چالیس روپے .....'' اس نے کیری بیگ کے ہینڈل میں اپنی انگلی پھنسائی اور پلٹ کر تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

''چور ..... چور ..... چور .....''

میڈیکل والے نے اس کی طرف اشارہ کر کے چلایا اور بڑی پھرتی سے کاؤنٹر کے باہر نکل کر اس کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ تھوڑی دور بھاگنے کے بعد خود ہی رُک کر اسے ایک گندی سی گالی دی اور اپنی میڈیکل کی طرف واپس جانے لگا۔ میڈیکل والے کی آواز سن کر بیسیوں لوگ اس کے پیچھے چور چور چلاتے ہوئے دوڑ پڑے .....

وہ جان توڑ کر بھاگنے لگا ..... بھاگتے بھاگتے جب وہ اپنے پیچھے آنے والوں کی پہنچ سے بہت دور ہو گیا ..... تو ..... اُس نے اپنی رفتار کم کی ..... ایک درخت سائے میں ہانپتے ہوئے رُکا ..... اس کی نظر اپنے اس ہاتھ کی طرف اٹھ گئی ..... جس میں دوا کی کیری بیگ کی بجائے صرف اس کا ہینڈل تھا ..... دوا بھاگ دوڑ میں کہیں گر چکی تھی .....

□□

ایک تھا بجوکا

ڈاکٹر بن خادم امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر چھوڑنے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد اپنے ملک کے ائیر پورٹ پر اتر کر اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔ ان کی اے سی کار حویلی کی طرف جانے والے کچے راستے پر آہستگی سے رینگ رہی تھی اور وہ سفید رنگ کا پٹھانی سوٹ پہنے، سر پر سبز عمامہ باندھے، اپنے ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچے راستے کے چھوٹے بڑے گڑھوں اور ابھرے پتھروں پر اچھلتی کودتی آہستہ روی سے آگے بڑھتی کار کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی ڈاکٹر بن خادم کی طرح اپنے گاؤں پہنچ کر بڑی شاد و مسرور ہے اور اُچھل کود سے اپنی مسرت کا اظہار کر رہی ہے۔

کار کی کھڑکی سے اندر داخل ہونے والے ہوا کے جھونکے کھیتوں کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبوؤں کے ساتھ کچی پکی فصلوں کی مہک بھی ساتھ لئے چلے آ رہے تھے اور ڈاکٹر بن خادم سے ٹکرا کر ان کی گھنی داڑھی کے لمبے لمبے بالوں کو گدگدا کر دوسری کھڑکی سے باہر نکلتے جا رہے تھے۔

وہ راستہ سیدھے ڈاکٹر بن خادم کی حویلی پر ختم ہوتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف چھوٹے بڑے کھیتوں کا سلسلہ دور تک چلتا چلا گیا تھا۔ ان کھیتوں میں سے کسی کھیت کی فصلیں کاٹی جا چکی تھیں تو کسی کی کاٹی جا رہی تھیں۔ کہیں کھیت جوتے جا رہے تھے تو کہیں بیج بویا جا رہا تھا۔ کسی کھیت میں سر اٹھانے والے پودوں پر دواؤں کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا تو کسی کھیت میں تیار فصلیں کھڑی جھوم رہی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ایک پُرسکون سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی اور وہ اپنی اے سی کار میں بیٹھے اطراف پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنی حویلی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا ڈرائیور بڑی آہستگی سے کار آگے بڑھا رہا تھا۔

اچانک ہی ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سکڑی، پیشانی پر بل پڑے اور وہ بے ساختہ بول پڑے

''گاڑی روکو ڈرائیور! گاڑی روکو.....''

کار روک کر ڈرائیور نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ دیکھو..... بجوکا کھڑا ہے اس کھیت میں''

ڈرائیور نے ڈاکٹر بن خادم کی نظروں کا تعاقب کیا تو اسے کھیت میں واقعی بجوکا کھڑا نظر آیا۔
بانس کی دو پھچیوں پر پیلی پینٹ اور لال شرٹ اڑس کر سر کی جگہ اوندھی کی گئی مٹی کی ہانڈی پر کالے رنگ سے آنکھ، منہ، ناک اور کان بنا کر کھیت میں کھڑا کیا گیا وہ بجوکا واقعی کوئی انسان ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کپڑے ہوا کے تیز جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے اور کپڑوں کی یہ پھڑ پھڑاہٹ روکی گئی کار تک پہنچ رہی تھی جسے سن کر ڈرائیور نے کہا:

''واقعی صاحب! یہاں تو بجوکا کھڑا ہے!!..... حیرت کی بات ہے..... بجوکا اور وہ بھی آپ کے علاقے میں؟..... بڑی حیرت کی بات ہے..... ویسے یہ کھیت عیدو بھائی کا ہے..... بلاؤں کیا انہیں؟.....''

''ہاں!.....''

ان کا جواب سن کر ڈرائیور نے انجن بند کیا اور دروازہ کھول کر قدم باہر نکالا ہی تھا کہ کہہ اٹھا۔

''ارے عیدو بھائی تو یہیں ہیں..... او عیدو بھائی..... دیکھو ڈاکٹر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں.....''

ڈرائیور کی آواز پر عیدو بھائی پانی کی نالی کی منڈیر درست کرتے کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور کار کی طرف لپکے۔

کار کے قریب پہنچ کر کچھ کہنے کیلئے وہ منہ کھولنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر بن خادم انہیں گھورتے ہوئے بولے۔

''یہ تمہارے کھیت میں بجوکا کیوں کھڑا ہے عیدو بھائی؟..... کیا میں نے یہ زمین تمہیں اسی لئے دی ہے؟..... میں نے تمہیں زمین دیتے ہوئے اس گاؤں میں موجود کھیتی باڑی کا اصول بتا کر کہا نہیں تھا کہ تم بھی اپنے کھیت میں بجوکا نہیں لگاؤ گے؟؟..... تم کو معلوم ہے نا کہ میں کھیتی باڑی کو زمین اور ہر طرح کی سہولت صرف اسی لئے دیتا ہوں کہ تم لوگ اپنا پیٹ بھر سکو..... مگر صرف اپنا پیٹ بھرنے کیلئے چھوٹے چھوٹے معصوم پرندوں کو بھوکا رہنے پر مجبور مت کرو۔''

''ہاں! ڈاکٹر سائب!..... او کا ہے نا..... ہمار بٹوا ہے نا..... رجو..... دراصل وا ہی کہے رائی.....''

''میں کچھ نہیں جانتا..... بس تم ابھی جاؤ اور بجوکا کو اپنے کھیت سے اکھاڑ پھینکو..... اور سنو عیدو

بھائی! اگر دوبارہ کھیت میں بجوکا دکھائی دیا تو میں نے تم کو کھیتی کیلئے جو زمین دی ہے اور جو بہت ساری سہولت دیتا ہوں نا وہ سب چھین لوں گا سمجھے..... ان بیچارے چھوٹے چھوٹے پرندوں کو بھی پیٹ ہوتا ہے..... ان کو بھی بھوک لگتی ہے..... ان کو بھی اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے..... وہ بھی خدا کی مخلوق ہیں اور خدا کی زمین کی پیداوار میں ان کا بھی حق ہوتا ہے..... مگر تم لوگ کھیتوں میں بجوکا کھڑا کر کے اپنے ذرا سے فائدے کیلئے ان معصوم جانوں کا حق چھین لیتے ہو..... خبردار جو آئندہ پھر ایسی غلطی کی تو..... جاؤ اور اکھاڑ پھینکو اسے....."

"اچھا سائب!"

اتنا کہہ کر عید و بھائی اپنے کھیت کی طرف جانے کو مڑے تو ڈاکٹر بن خادم نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ ان کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو ٹپک پڑے اور انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر ڈرائیور کو کار آگے بڑھانے کو کہا۔

ڈرائیور نے اپنی طرف کا کھولا ہوا دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔ کار دوبارہ آہستگی سے آگے بڑھنے لگی تو اس نے کن آنکھیوں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کار میں لگے شیشے میں ان کا چہرہ دیکھا۔

ان کے ہونٹوں کی پُرسکون مسکراہٹ غائب تھی۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔ ان کی پیشانی پر بل تھے اور گہری گہری سانسیں لینے سے انکے نتھنے پھول پچک رہے تھے..... وہ آہستہ روی سے کار آگے بڑھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کار حویلی کے وال کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئی۔ ڈاکٹر بن خادم کار سے اترے اور بوجھل قدموں سے حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

حویلی کے ایک کمرے میں پہنچ کر انہوں نے اپنا عمامہ اتار کر ایک اسٹول پر رکھا اور خود کو صوفے پر اوندھا گرا لیا۔

تھوڑی دیر تک وہ صوفے پر یونہی پڑے گہری گہری سانسیں لیتے رہے پھر سر اُٹھا کر صوفے پر ہی پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔

انہیں ٹی وی کے اسکرین پر امریکی صنعت و حرفت کا مرکز ورلڈ ٹریڈ سینٹر آگ اور دھوئیں اگلتا نظر آیا اور نیوز ریڈر کی آواز اُن کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔

''آج امریکی ایئر لائنز کے دو مسافر بردار جہاز اغوا کر لئے گئے۔ اغوا کے تھوڑی دیر بعد اغوا کاروں نے دونوں ہی جہازوں پر مکمل کنٹرول کر کے ان کا رخ امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی طرف کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جہاز اس سے ٹکرا دیئے۔ ایک کے بعد ایک ہونے والی ٹکر سے امریکہ کا ۱۱۰ منزلہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر صرف پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور ان جہازوں میں موجود مسافروں کے ساتھ ہی ٹریڈ سینٹر میں موجود پانچ ہزار امریکی افراد بھی لقمہ اجل بن گئے۔''

نیوز ریڈر کی آواز تھمی اور ٹی وی پر دو جہاز پرواز کرتے دکھائی دیئے۔ دونوں ہی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے پس منظر سے اس کے قریب آتے نظر آئے اور پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک جہاز برق رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہوا سیدھا ٹریڈ سینٹر سے ٹکرا گیا۔ وہ آگ کے ساتھ ساتھ کالے کالے دھوئیں بھی اُگلنے لگا پھر چند ہی ثانیے بعد دوسرا جہاز بھی دھواں اور آگ اُگلتی اس عمارت سے اس تیزی سے ٹکرایا کہ اگلا سرا عمارت کی دوسری سمت سے باہر جھانکنے لگا اور پھر پورا ورلڈ ٹریڈ سینٹر آگ کے ساتھ دھوئیں اگلتا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

ٹی وی اسکرین پر اس منظر کو دیکھ کر ڈاکٹر بن خادم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور ذہن کے اسکرین پر ان کے بچپن کا ایک منظر اُجاگر ہو گیا۔

وہ ایک کھیت میں کھڑے اس بجوکا کو حقارت سے دیکھ رہے ہیں جسے ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم ہاتھوں نے کھیت کی زمین سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ بجوکا کا سر، جو کہ حقیقت میں ایک مٹی کی ہانڈی ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر بکھرا پڑا ہے۔ ان کا معصوم ذہن طیش میں آ گیا ہے اور وہ آگے بڑھ کر بجوکا کے دونوں ہاتھوں پر پیر رکھ کر کھڑے ہو گئے ہیں پھر نیچے جھک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی پوری طاقت لگا کر کھڑے ہو گئے ہیں بجوکا کے دونوں ہی ہاتھ چٹاخ چٹاخ کی آواز کیساتھ ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کے بعد اس کا ایک پیر بھی انہوں نے توڑ کر ایک طرف پھینک دیا..... بجوکا کی یہ درگت دیکھ کر اِدھر اُدھر درختوں پر دُبکے بیٹھے پرندے کھیت کی تیار فصل سے اپنا حصہ حاصل کرنے کیلئے اترنے لگے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹوں پر ایک ابدی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر نیچے جھکا لیا ہے ان کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل کر کھیت کی زمین میں جذب ہو گئے ہیں اور ان کی نظر بجوکا کے کھڑے رہنے کی جگہ پر جا پڑی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے ٹوٹے بکھرے بجوکا پر حقارت سے تھوک دیا ہے۔

اپنے ذہن کے اسکرین پر دھند لکا چھانے کے بعد انہوں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر

کی فلک سے باتیں کرتی پرانی تصویر اس پر اجاگر تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر نہیں بلکہ وہ بھی ایک بجوکا ہے..... ایک بہت بڑا ظالم بجوکا..... جو دنیا کے چھوٹے چھوٹے کمزور ممالک کے معصوم انسانوں کو ڈرانے دھمکانے کیلئے اپنا ہاتھ پھیلانے اور سر اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایسا محسوس ہوتے ہی ان کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے دو ایک گہری گہری سانسیں لے کر اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول بند کیں اور صوفے پر پڑا ریموٹ اُٹھا کر پوری طاقت اور حقارت سے ٹی وی پر موجود ورلڈ ٹریڈ سینٹر نامی ظالم بجوکا کو دے مارا اور اپنا ماتھا صوفے پر ٹیک کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

□□

باپو کا کا

ساٹھ پینسٹھ برس کے باپو کا کا میں نام کے علاوہ اور کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ''باپو کا کا'' نام ہی کہاں تھا، دور شتوں کی پہچان تھا۔ ویسے ان کا اصل نام رام داس تھا مگر ''اہنسا پارک'' میں رکھوالے کی حیثیت سے تقرری کے بعد وہاں تفریح کے لئے آنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں نے انہیں ''باپو کا کا'' بنا دیا تھا۔

لوگ پارک میں لگے مہاتما گاندھی کے قد آدم مجسمے کو دیکھتے اور پھر انہیں دیکھ کر کہہ اٹھتے۔

''ارے باپو..... ارے کا کا..... تم تو بالکل باپو گاندھی جیسے لگتے ہو..... بالکل باپو لگتے ہو کا کا..... باپو کا کا.....''

جب وہ پارک میں آئے تھے تو کرتا پاجامہ پہنتے تھے لیکن گاندھی جی کے چاہنے والوں نے انہیں دھوتیاں لا کر دیں اور پہننے پر مجبور کیا۔ خود کے تئیں لوگوں کے پیار کو دیکھ کر باپو کا کا نے کرتا پاجامہ ترک کر دیا اور بخوشی دھوتی پہننے لگے۔

دس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی انہیں اچھی طرح سے یاد تھا کہ اسلم نام کے ایک نوجوان نے ہی انہیں سب سے پہلے باپو گاندھی کے ہم شکل ہونے کا احساس دلا کر ایک گول فریم کی بغیر نمبر کی عینک انہیں پہننے کو دی تھی کیونکہ بڑھاپے کے باوجود بھی ان کی بینائی کمزور نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے روز اس کے دوست ارون نے ایک لاٹھی لا کر دی..... اور پھر ان دونوں نے مل کر ایک دھوتی بھی خرید کر انہیں دی تھی۔ ان دوستوں کی تقلید میں دیگر اور بہت سے لوگوں نے بھی انہیں دھوتیاں لا کر دی تھیں۔ اس طرح ان کے پاس اچھی خاصی تعداد میں دھوتیاں جمع ہو گئیں۔ تب ہی تو وہ روزانہ صبح اشنان کے بعد دھوتی تبدیل کیا کرتے تھے۔ لیکن..... اس صبح انہوں نے اشنان نہیں کیا اور نہ ہی دھوتی تبدیل کی۔

اس روز جب باپو کا کی آنکھ کھلی تو صبح کے دھندلکے مشرقی افق پر سنہری تھال چھوڑ کر جا چکے تھے۔ پارک کی دس سالہ دیکھ ریکھ کے دوران پہلی مرتبہ ان کی آنکھ اتنی دیری پر کھلی تھی ورنہ صبح صادق سے پہلے ہی اپنا پیوند زدہ بستر چھوڑ دینا ان کا معمول تھا۔

وہ موسم کی شدت سے بے پرواہ اپنا بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ..... دھوتی ٹھیک کرتے ..... دھوتی کے پلّے کو اپنے بائیں کندھے پر ڈالتے ..... دائیں طرف اڑسا ہوا بٹوہ درست کرتے ..... سرہانے لاٹھی اور عینک کے پاس رکھی ہوئی پیتل کی بالٹی اٹھا کر اپنی جھونپڑی کا دروازہ کھولتے ..... اور سامنے دیکھتے ..... باہر تھوڑی ہی دوری پر دو فٹ اونچے چبوترے پر کھڑے مہاتما گاندھی کے قد آدم مجسمے پر ان کی نظر جا ٹھہرتی ..... پوسٹ لیمپ کی روشنی میں ماہر مجسمہ ساز کے ہاتھوں قائم کی گئی ابدی مسکراہٹ گاندھی جی کے ہونٹوں پر پھیلی انہیں صاف دکھائی دیتی ..... انہیں محسوس ہوتا کہ مجسمے کے ساتھ ہی کوئی ان کے اندر بھی مسکرا رہا ہے ..... اس کے ہونٹوں پر گاندھی جی کی ابدی مسکراہٹ ہے ..... اور وہ دھیرے دھیرے پھیل رہی ہے ..... پھیلتی جا رہی ہے ..... ان کے روم روم میں پھیل رہی ہے ..... اور پھیلتے پھیلتے خود ان کے ہونٹوں تک آ گئی ہے ..... باپو کا کا خود بھی مسکرانے لگتے ..... ان ہونٹوں پر وہی ابدی مسکراہٹ پھیل جاتی .....

..... مگر اپنی ابدی مسکراہٹ سے لاعلم باپو کا کا اطراف کا جائزہ لیتے ..... انہیں پارک کی ہر شے مسکراتی دکھائی دیتی ..... بیل بوٹے ..... درخت ..... پودے ..... جھاڑ جھنکاڑ ..... دیواریں ..... زمین ..... اور ..... آسمان ..... سبھی مسکراتے محسوس ہوتے ..... اس مسکراتی فضا میں باپو کا کا اپنے ہاتھ میں بالٹی لئے سیدھے پارک کی بورنگ پر چلے جاتے ..... وہاں تین چار بالٹی پانی سے اشنان کرتے ..... واپس اپنی جھونپڑی میں جا کر دھوتی تبدیل کرتے ..... اتاری ہوئی گیلی دھوتی باہر لا کر دیوار کے قریب پڑے پتھر پر رکھتے اور پاس ہی کھڑے نیم کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر پرایانام کا آسن جما لیتے ..... ان کا رخ مہاتما گاندھی کے مجسمے کی طرف ہوتا ..... اس دوران ان کی زبان سے گاندھی جی کے بول الفاظ کی صورت میں نکلتے اور سوئی ہوئی چڑیوں کو جگاتے رہتے .....

''ایشور اللہ تیرے نام ..... ایشور اللہ تیرے نام .....''

اس بول کی تکرار کو سن کر بیدار ہونے والی چڑیاں جب دوسری خوابیدہ چڑیوں کو جگانا شروع کرتیں تو نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے باپو کا کا اپنی آنکھیں موند لیتے اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگتے .....

اس دوران کبھی کبھی کوئل کی کوک اور کوؤں کی کائیں کائیں بھی ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی رہتیں ..... تھوڑی دیر بعد جب چڑیوں کا خوشگوار شور اپنے شباب پر جا پہنچتا تو سورج چپکے چپکے مشرقی کنارے سے سر اٹھاتا ..... اور دھیرے دھیرے اوپر سرکنے لگتا ..... جیسے جیسے اجالا پھیلتا چڑیوں کا شور اس میں تحلیل ہو کر مدھم ہوتا جاتا ..... جب سورج کی نرم گرم شعاعیں باپو کا کا تک پہنچتیں تو وہ اپنی آنکھیں کھولتے ..... ان کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتیں اور گاندھی جی کے مجسمے پر سے رینگتی ہوئی ان کے چہرے پر جا ٹھہرتیں ..... پھر وہاں سے پھسلتی ہوئی مجسمے کے پیروں تک چلی جاتیں ..... وہ اٹھتے اور آگے بڑھ کر گاندھی جی کے پیروں کے پاس کی گرد آشیرواد کے طور پر اٹھا کر بڑے احترام سے اپنے ماتھے پر لگا لیتے اور سیدھے اپنی جھونپڑی میں چلے جاتے۔ اندر جا کر اپنا بستر اٹھا کر ایک کنارے رکھتے ..... عینک اپنی آنکھوں پر لگاتے ..... اور پھر لاٹھی اٹھا کر جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکلتے ..... پتھر پر رکھی گیلی دھوتی اٹھاتے ..... دوبارہ بورنگ پر جاتے ..... اسے اچھی طرح دھوتے اور سوکھنے کیلئے پھیلا کر پارک کی صاف صفائی میں جٹ جاتے۔

لیکن ..... اس روز جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ چڑیوں کا خوشگوار شور کمزور پڑ چکا تھا اور ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی چڑیوں کے شور ہی کی طرح کمزور ہو چکے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے ..... آنکھوں کی سفیدی میں نظر آنے والے لال ڈورے صاف ظاہر کر رہے تھے کہ ان کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے ..... اور واقعی اخیر شب تک انہیں نیند نہیں آئی ہے ..... وہ جاگ کر کروٹیں بدلتے رہے تھے ..... بے چین رہے تھے ..... انہیں رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ ان کے چاروں کی طرف آگ ہی آگ ہے ..... آگ میں بہت سے لوگ جل رہے ہیں ..... چیخ رہے ہیں ..... وہ آگ دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے ..... انہیں بھی جلا رہی ہے ..... ان کی جھونپڑی ..... پورا پارک ..... اور خود گاندھی جی بھی اس آگ کی لپیٹ میں ہیں ..... باپو کا کا گاندھی جی کو بچانا چاہتے ہیں ..... گاندھی جی کی طرف بڑھتے ہیں ..... مگر گاندھی جی غائب ہو جاتے ہیں ..... انہیں چبوترا خالی دکھائی دیتا ہے ..... جس کے اطراف میں آگ ہی آگ ہے ..... پورے پارک میں آگ ہے ..... پارک کے باہر جہاں بھی ان کی نظر جاتی ہے ..... آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔ ..... اور دور دور تک گاندھی جی انہیں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے ہیں ..... انہیں سب احساسات میں کروٹیں بدلتے ہوئے ان کی رات گذری تھی ..... وہ اپنے آپ کو بہت سمجھاتے رہے ..... دلاسے دیتے رہے ..... مگر ان کا دل نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ سمجھتا ہی نہیں

تھا..... وہ اسے جتنا بھی سمجھاتے اتنا ہی الجھتا چلا جاتا..... اور الجھتا بھی کیوں نہیں کہ شہر میں برپا ہونے والا فساد اُن کی آنکھوں کے سامنے ہی تو پھوٹا تھا۔

پارک میں اسلم اور ارون کے درمیان کوئی سخت قسم کی بحث جاری تھی۔ باپو کا کا ان دونوں کی زوردار بحث سن ہی رہے تھے کہ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے..... باپو کا کا انہیں آواز دیتے دیتے لپکے مگر انکے قریب پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں نے دونوں کو الگ کر دیا..... اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہیں الگ کرنیوالے لوگ ہی آپس میں الجھ گئے..... ہاتھا پائی کا زور چلا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کر گیا۔

پارک سے پھوٹنے والے فساد نے درجنوں لاشیں گرا کر..... پچاسوں کو زخمی کر کے..... سینکڑوں مقامات نذر آتش کر کے پورے شہر کو دھوئیں میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا..... ہندوؤں نے مسلمانوں کا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کا دل کھول کر جانی و مالی نقصان کرنا جاری کر رکھا تھا لیکن حساس باپو کا کا بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر رات کے آخر پہر تک جاگ کر بس ذرا دیر ہی سو کر اٹھے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔

انہوں نے اپنی سوجی آنکھوں کے پپوٹے دو ایک بار کھول بند کئے اور آہستگی سے اٹھ بیٹھے..... ایک سرد آہ بھری اور بالٹی اٹھائے بغیر ہی بڑی نقاہت کے ساتھ جھونپڑی کے دروازے تک آئے۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا اور چونک پڑے کیونکہ سامنے چبوترا خالی پڑا تھا اور مہاتما گاندھی کا مجسمہ غائب تھا۔ وہ جلدی جلدی پارک کے گیٹ پر لگے پبلک ٹیلی فون کی طرف لپکے۔

اپنی دھوتی میں اڑسائے بٹوے سے ایک سکہ نکال کر ریسیور اٹھایا۔ سکہ سوراخ میں ڈالا..... پولس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا اور جلدی جلدی مہاتما گاندھی کے مجسمے کے غائب ہونے کی رپورٹ دے کر گیٹ پر ہی پولس کا انتظار کرنے لگے۔

پارک کے چاروں طرف دور نزدیک جگہ جگہ سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اوپر اٹھتے انہیں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان پر افسوس کرتے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کرفیو کی قائم کردہ خاموش فضا میں پولس جیپ کی آواز ابھر کر ان کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔ انہوں نے پارک کا گیٹ کھول دیا۔

جیپ سیدھے پارک میں داخل ہوئی۔ اس کا انجن خاموش ہوا اور ایک انسپکٹر کے ساتھ ہی کئی کانسٹیبل نیچے اتر کر ان کی طرف لپکے۔ انسپکٹر نے باپو کا کا کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔

''کون سا پتلا غائب ہوا ہے؟.....''

''گاندھی جی کا ساب..... وہ اس چبوترے پر کا''

باپو کا کا نے خالی چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابے بڈھے! یہاں شہر کی کنڈیشن خراب ہے اور تجھے مذاق سوجھی ہے..... وہ چبوترے پر تیرا باپ کھڑا ہے کیا؟.....'' انسپکٹر نے گاندھی کے مجسمے کو دیکھ کر کہا۔

''کہاں ساب..... وہ تو خالی ہے!'' انہوں نے حیرت سے چبوترے کو دیکھا۔

''ابے اندھے تجھی آئی لا..... مذاق کرتا ہے بڈھے تجھی مائی لا سالے یہ لے''

اتنا کہہ کر انسپکٹر نے ایک زوردار لات باپو کا کا کو دے ماری..... وہ چاروں خانے چت زمین پر گر گئے..... مگر ان کے گرتے ہی چبوترے کی طرف سے کسی بھاری بھرکم چیز کے گرنے کی آواز پر انسپکٹر نے سر گھما کر دیکھا..... چبوترے کے نیچے مہاتما گاندھی کا مجسمہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔ □□

درندے

میں راہ دیکھ رہا ہوں ..... میں دیکھ سکتا ہوں ..... میں بھی دیکھ رہا ہوں ..... میری نظروں اور لوگوں کی نظروں میں فرق ہے ..... میں چیزوں کے آر پار دیکھنے والی اپنی نظروں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہوں جو دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے ..... حالانکہ میری آنکھوں کی سفیدی لوگوں کی آنکھوں کی ہی طرح سفید ہے ..... مگر میری پتلیاں بھی سفید ہیں ..... جس طرح انسانوں کا خون کبھی کبھی سفید ہو جایا کرتا ہے ..... اگر چہ کہ سفیدی امن کی نشانی ہے ..... شانتی کی علامت ہے ..... مگر جب لوگوں کا خون سفید ہوتا ہے تو دنگا، فساد، لوٹ مار اور تعصب کا بازار گرم ہو جاتا ہے ..... لیکن میری آنکھوں کی پتلیوں کی سفیدی سے کوئی دنگا نہیں ہوگا ..... کوئی فساد نہیں پھوٹے گا ..... کہیں گولی نہیں چلے گی ..... کسی کا خون نہیں بہے گا ..... کہیں آگ نہیں لگائی جائے گی ..... کسی کی عصمت پامال نہیں ہوگی ..... کیونکہ میری پتلیاں تو ابتداء ہی سے سفید ہیں۔ صرف پتلیاں ہی کیا ..... میرا تو پورا وجود ہی سفید ہے ..... اور میں اس اونچائی سے راشٹر پتی بھون کے اندر دیکھ رہا ہوں ..... وہاں اُتھل پتھل سی مچی ہوئی ہے ..... کھڑکیوں کے پردے بدلے جا رہے ہیں ..... فرش کو پرانی قالین سے نجات دلا کر نئی قالین سے آراستہ کیا جا رہا ہے ..... خوابگاہ کو نئے فانوس اور نئے گلدستوں سے سنوارا جا رہا ہے ..... ٹوٹے پھوٹے فرنیچر بدلے جا رہے ہیں ..... پرانی کرسیوں کی جگہ نئی کرسیاں براجمان ہو رہی ہیں ..... میز پوش تبدیل ہو رہا ہے ..... تکیوں کے غلاف بیڈ کور ..... اور دیگر بہت سی پرانی چیزیں بدل کر نئی چیزیں لائی جا رہی ہیں ..... اور بدل جانے والی ہر شئے کو انتظار ہے ..... وہی انتظار جو کہ بڑا ست رو ہوا کرتا ہے ..... نہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ جاتی ہے کہ یہ وقت کو بھی آہستہ روی پر مجبور کر دیتا ہے ..... وہی وقت جو کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، نہ جانے کیوں انتظار کی باتوں کے بہکاوے میں آ جاتا ہے اور انتظار کرنے والے کو چڑھانے کیلئے رینگنے کی سی

چال چلنے لگتا ہے ..... پھر بھی انتظار ہے اس کا ..... بدل جانے والی ہر شے اس کا انتظار کر رہی ہے ..... میں بھی تو اس کا انتظار کر رہا ہوں ..... پورا ملک ہی اس کا منتظر ہے ..... میں بھی تو اسی کی راہ دیکھ رہا ہوں .....

بدل جانے والی تمام اشیاء اور پورے ملک کے انتظار کے ختم ہونے کے ساتھ ہی میرا بھی انتظار ختم ہو گیا ہے .....

وہ آ گیا ہے .....

سب جس کے منتظر ہیں ..... وہ آ گیا ہے .....

بدل جانے والی قالین، کھڑکی کے پردے، خوابگاہ کے فانوس، گلدستے، فرنیچر، کرسیاں، میز پوش، تکیوں کے غلاف، بیڈ کور دیگر اشیاء اور پورے ملک کو ایک مسرور کن خوشی کا احساس ہو رہا ہے ..... میں بھی تو اس خوشی کو محسوس کر رہا ہوں .....

مجھے اپنے اطراف میں قوس قزح کے رنگ بکھرے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہوا خوشبو بکھیرتی محسوس ہو رہی ہے ..... ایسا لگ رہا ہے جیسے درخت اس کی آمد پر جھوم جھوم کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہے ہیں ..... دھرتی اپنا دل بچھا رہی ہے ..... آسمان اپنی بانہیں پھیلائے ہوئے ہے ..... پرندے خوشی سے چہچہاتے پھر رہے ہیں ..... جھرنے اور آبشار اپنی جل ترنگ سے اس کا استقبال کر رہے ہیں ..... کبوتر اور فاختائیں اپنے پر پھڑ پھڑا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں ..... کہ ..... وہ بارود کی فضا کو ختم کرنے آیا ہے ..... بموں کو خاموش کروانے آیا ہے ..... گنوں کے سر جھکانے آیا ہے ..... ہاتھوں سے بندوق چھڑانے آیا ہے .....

تبھی تو فوجیں اسے گارڈ آف آنر پیش کر رہی ہیں .....

وہ عدم تشدد اور امن کے پیغام رساں کی سمادھی پر عقیدت کے پھول نچھاور کر رہا ہے .....

شیخ المشائخ کے مزار پر ہاتھ باندھے، باادب، نظریں نیچی کئے کھڑا ہے .....

..... اور .....

اور ..... اب وہ میری طرف آ رہا ہے .....

ایک بے دھواں گاڑی میں ..... اس گاڑی سے دھواں نہ نکلے اس کے لئے بارہ لاکھ روپے خرچ کئے گئے ہیں ..... تب کہیں جا کر اسے ''الیکٹرا وین'' کا نام دیا گیا ہے ..... اس وین میں جو شیشے کھڑکیوں پر لگے ہیں وہ بلٹ پروف ہیں ..... وین میں قیمتی قالین بچھا ہے ..... نرم گدا ہے ..... قیمتی پردے ہیں ..... اور وہ اس الیکٹرا وین کو صرف مجھ تک آنے کے لئے استعمال کر رہا ہے .....

وہ آ گیا ہے .....

الیکٹرا ڈ وین میرے سامنے آ گئی ہے......

وہ اس کا دروازہ کھول رہا ہے...... دروازہ کھول کر اس سے نیچے اتر رہا ہے...... اس کے بعد میرے ملک کے وزیر اعظم بھی اترے ہیں...... اور وہ نیچے اتر کر بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہا ہے......

مبہوت سا کھڑا مجھے تکے جا رہا ہے......

ایک ٹھنڈی سانس لے کر مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے ہے...... میں بھی اسے بغور دیکھ رہا ہوں...... بلکہ اس کے ماضی کو دیکھنے لگا ہوں......

وہ میرے ہی ملک کا بچہ ہے...... میری ہی دھرتی کا باشندہ ہے...... میرا ملک جلد ہی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوا ہے...... ایک نئے ملک کا مطالبہ بڑے زور و شور سے جاری ہے...... نیا ملک بن رہا ہے...... خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں...... لاشیں گرتی جا رہی ہیں...... لوٹ مار جاری ہے...... آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے...... فضا میں آہ و بکاہ، چیخ و پکار کی آوازوں کا شور ہے...... جائیداد لوٹی جا رہی ہے...... عصمتیں پامال ہو رہی ہیں...... ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے......

انسانیت زخمی پڑی سسک رہی ہے...... حیوانیت قہقہہ لگا رہی ہے...... ایک زمین دو حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے...... کچھ لوگ چھوٹے حصے سے بڑے حصے کی طرف بڑھ رہے ہیں...... اور کچھ لوگ بڑے حصے سے چھوٹے حصے کی طرف لپک رہے ہیں......

چھوٹے حصے کی طرف لپکنے والوں میں وہ بھی شامل ہے...... وہ ایک بچہ ہے جو اس وقت میرے سامنے ایک مکمل آدمی کی صورت میں کھڑا حیرت سے مجھے تکے جا رہا ہے اور میں اس کے ماضی کی تصویریں دیکھ رہا ہوں......

...... وہ تعلیم حاصل کرتے کرتے جوان ہوا ہے...... فوج میں بھرتی ہوا ہے...... اس کی شادی ہو رہی ہے...... وہ ترقی کرتے کرتے جنرل بنا ہے...... اس کے گھر کئی بچے پیدا ہوئے ہیں...... جس ملک کی کوکھ سے اس کے ملک نے جنم لیا ہے...... وہ اسی ملک پر حملہ کر رہا ہے...... جہاز میں بیٹھا اڑ رہا ہے...... احکام دے رہا ہے...... اپنے ملک کی حکومت برخاست کر کے وہاں کا صدر بن رہا ہے...... صدر بن کر امن کی بات کر رہا ہے......

...... امن کے لئے اپنی کوکھ سے اس کے ملک کو جنم دینے والے ملک کی طرف امن کا پیغام لے کر بڑھ رہا ہے...... اس ملک کے لوگ خوش دلی سے اس کا استقبال کر رہے ہیں...... اور امن کے نام پر اس سے باتیں کر رہے ہیں......

..... وہاں کی فوجیں اسے امن کے نام پر سلامی دے رہی ہیں ..... وہ اس ملک کے تاریخی مقامات دیکھ رہا ہے ..... اور میری طرف بڑھ رہا ہے ..... کہ ..... میں بھی تو اسی ملک کا ایک حصہ ہوں .....

..... وہ میرے سامنے آ گیا ہے ..... اور مجھے حیرت سے دیکھ رہا ہے ..... رشک سے تکے جا رہا ہے ..... اور میں اس کے ماضی سے نکل رہا ہوں .....

..... حال میں آ گیا ہوں ..... اسے دیکھ رہا ہوں ..... اس کے پاس میرے ملک کے وزیر اعظم کھڑے ہیں ..... ان کے قریب ہی الیکٹراوین بھی کھڑی ہے .....

وہ امن کے نام پر میرے ملک میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر آیا ہے ..... وہ دونوں ہی ممالک کے لوگوں کے لئے محبت کا پیغام لے کر آیا ہے ..... وہ توپوں، ٹینکوں، بندوقوں اور بکتر بند گاڑیوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ جنگی طیاروں، بموں اور میزائیلوں کے شور سے تنگ آ کر امن چاہ رہا ہے ..... خون کی ندیاں بہانے کی بجائے امنؔ کے دریا رواں کرنا چاہتا ہے ..... میں دعا کرتا ہوں ..... اس کی کوشش کامیاب ہو جائے ..... میں نے بہت سارے محبت کرنے والوں کو دعائیں دی ہیں ..... بہت سے پیار کے متلاشیوں کیلئے دعا کی ہے ..... مگر اب کی مرتبہ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے دل کے بھی دل سے اس کے لئے دعا کر رہا ہوں ..... کاش کہ اس کا مشن کامیاب ہو جائے ..... دونوں ممالک میں پیار بڑھے ..... محبت پھیلے ..... امن و امان قائم ہو ..... میں دعا کرتا ہوں ..... میں بار بار دعا کروں گا ..... جو دعا میں کر رہا ہوں یہ دعا میں بار بار کروں گا ..... اس کے بھی تو لب ہل رہے ہیں ..... میں اس کے ہونٹوں کو بغور دیکھ رہا ہوں ..... وہ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں ..... اور وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوا کہہ رہا ہے .....

''واہ سبحان اللہ! ..... کیا کہنے ..... واقعی

اِک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل

ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے .....''

اس کی زبان سے اپنی تعریف سن کر میں محبت کی نشانی ..... میں تاج محل مسرور ہو گیا ہوں ..... اور اس کی آگے کی بات سن رہا ہوں ..... وہ میرے ملک کے وزیر اعظم سے کہہ رہا ہے .....

''اگر میری کرسی خطرے میں رہی تو آپ جنگ شروع کریں گے اور اگر آپ کی کرسی کو خطرہ رہا تو میں''

اتنا کہہ کر اس نے میرے ملک کے وزیر اعظم سے ہاتھ ملایا ہے ..... جنہیں ایک دوسرے سے ملتا دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ انسان نہیں ..... بلکہ ..... دو بہت ہی بڑے ..... خونی درندے ..... ایک دوسرے سے مل رہے ہیں .....

□□

ہندوستانی

وہ سفید پوش شخص بھی ایک ہندوستانی ہی تھا..... جو اس وقت بلند و بالا عمارت کی پانچویں منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دینے والے وسیع و عریض آزاد میدان کا جائزہ لے رہا تھا۔

میدان میں ہزاروں ہندوستانی شہیدان وطن کو خراج عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے تھے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی آزادی کی سالگرہ پر نفاست سے سجائے گئے اسٹیج پر متفرق رنگوں کی روشنیاں بڑی خوبصورت معلوم پڑ رہی تھیں۔ پورے میدان میں جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ قمقمے روشن تھے۔ جھنڈیاں ہوا کے جھونکوں پر حرکت کر رہی تھیں اور اسٹیج پر ایک شعلہ بیان مقرر جلیان والا باغ کے خونیں واقعہ کو بہت ہی جوشیلے اور پرسوز انداز میں بیان کر رہا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی اس کی آواز ہزاروں ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ اس سفید پوش ہندوستانی کو بھی سنائی دے رہی تھی۔

''میرے ہندوستانی بھائیو! تاریخ کبھی بھی جلیان والا باغ کے مظلوم شہیدوں کو فراموش نہیں کر سکتی..... اور نہ ہی سفید فاموں کے اس ظلم کو بھلا سکتی ہے..... کیونکہ ان ظالم اور بے رحم حیوانوں نے معصوم اور نہتے ہندوستانیوں پر گولیوں کی بارش کر کے اس میدان میں موجود کنویں کو لاشوں سے پاٹ دیا تھا..... بے شمار معصوم اور بے گناہ ہندوستانیوں کے خون سے جلیان والا باغ کی سرزمین سرخ ہو گئی تھی..... جا بجا لاشوں کے انبار لگا دیئے تھے ان حیوان صفت انگریزوں نے اور ہم ہندوستانی.....''

مقرر کی آواز زوردار دھماکے کی آواز میں گم ہو گئی تھی..... اسٹیج کے پرخچے اڑتے دکھائی دیئے..... اور پھر یکے بعد دیگرے چھ سات دھماکوں کی آواز سے فضا لرز اٹھی..... دھوئیں..... گرد..... اور شعلوں کے ساتھ ساتھ اس میدان میں موجود لوگوں کے چیتھڑے فضا میں بلند ہونے لگے اور سفید پوش ہندوستانی کے ذہن کی اسکرین پر بچپن کے چند واقعات اجاگر ہونے لگے۔

وہ کئی ایک پتنگوں کی ٹانگیں ایک ساتھ باندھ کر جمع شدہ کاغذوں کی آگ میں انہیں ڈال رہا ہے انہیں جلتا..... تڑپتا اور آگ میں بھنتا دیکھ کر خوشی سے اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہا ہے..... چڑیا کے بچوں کو گھونسلوں سے نکال کر بڑی بے دردی سے ان کے پروں کو نوچ کر ہوا میں اڑاتے ہوئے ہنستا جا رہا ہے..... چڑیا کے بچے درد سے چلا رہے ہیں..... وہ قہقہہ لگا رہا ہے..... تتلی کو پکڑ کر اس کے خوشنما پروں کو ایک جھٹکے میں اکھاڑ رہا ہے..... چھوٹے سے جھونپڑے میں موجود چیونٹے چیونٹیوں کو اپنے پیروں سے بڑی بے دردی کے ساتھ مسلتا جا رہا ہے..... مینڈک کے چھوٹے بڑے زندہ بچوں کو ایک تار میں پرو کر انہیں جمع شدہ کاغذوں میں لگائی گئی آگ پر زندہ بھون رہا ہے..... وہ تڑپ رہے ہیں..... ان کے جلنے سے ایک قسم کی سنسناہٹ اسے سنائی دے رہی ہے جسے سن کر اسے ایک عجیب سا سکون مل رہا ہے.....

اچانک اس کے ذہن کے اسکرین کی تصویریں صاف ہوئیں اور اس نے چونک کر کھڑکی سے دکھائی دینے والے شعلوں..... دھوئیں..... گرد اور لوگوں کے چیتھڑوں کو دیکھا..... تھوڑی دیر تک دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی اور اس نے چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ کر کھڑکی بند کر لی۔

□□

لائن آف کنٹرول

''ہررر..... آہا..... اوہو..... شی شی..... ہر ہر..... شی ہر ہر ہررر.....''

جیسی مختلف آوازیں نکالتا دین محمد اپنے ریوڑ کی بکریوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کی کمر پر بندھی لال رنگ کی چھوٹی سی تہبند اس کے گھٹنوں پر جھول رہی تھی لیکن سر پر ہرے رنگ کی ایک بڑی سی پگڑی لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں لال پیلی موتیوں کی لمبی سی مالا لٹک رہی تھی اور وہ دائیں ہاتھ میں ایک لمبی سی پرانی لاٹھی لئے اس وقت ہندوستانی سرحد کے قریب ہی ان بکریوں کو آگے کی جانب ہانک رہا تھا۔ جبکہ مونا نامی اس کی پیاری سفید بکری روزانہ کی ہی طرح اس کے بائیں طرف ہی چل رہی تھی۔

دین محمد کو ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر موجود خاردار تاروں کا سلسلہ دور تک پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ صبح کے سورج نے مشرق سے سر تک نہیں نکالا تھا مگر وہ اپنے معمول کے مطابق بکریاں چرانے کے لئے اس ریوڑ کر لے کر نکل پڑا تھا۔

مشرقی افق کے دھندلے دھندلے اجالوں میں بکریوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا دین محمد سوچ رہا تھا کہ وہ خلاف معمول ذرا کچھ آگے ہی نکل آیا ہے۔ اس کے ریوڑ کی بکریاں ممیاتی چلاتی آگے بڑھ رہی تھیں مگر اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا کہ مونا بدک گئی اور ہندوستانی سرحد کے خاردار تاروں کی طرف دوڑ پڑی۔

دین محمد تمام بکریوں کو ہانکنا چھوڑ کر مونا کو پکڑنے کیلئے اس کی طرف چلاتے ہوئے لپکا۔

''چل آ مونا..... آآآآ..... آ مونا آآ..... چل آآآ..... آ مونا..... آآ''

مونا رُکنے کی بجائے مزید تیزی سے دوڑ کر ہندوستانی سرحد پار کر گئی اور لائن آف کنٹرول پر جا پہنچی۔

دین محمد نے خاردار تاروں کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان خاردار تاروں کے بعد ہندوستان کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے ریوڑ کی بکریوں کو ہندوستان کی سرحد کے اندر ہی کچھ

دور تک ہانک دیا اور خاردار تاروں کے پار لائن آف کنٹرول پر موجود مونا کو چُمکار چُمکار کر واپس بلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آ مونا ..... آ آ ..... چل آ آ ..... لے آ آ .....''

مونا نے سر گھما کر اسے دیکھا ..... ہندوستانی سرحد کے خاردار تاروں کو دیکھا ..... اور پاکستانی سرحد کی طرف دیکھ کر دور تک نظریں دوڑائیں مگر دونوں سرحدوں کے درمیان کچھ فرق نہ پا کر لائن آف کنٹرول پر اُگی گھاس پر منہ مارنے لگی۔

دین محمد نے سوچا کہ اسے پکڑ کر لے آئے مگر اسے رامو کاکا کی یاد آ گئی۔ وہ اس کے ہی گاؤں کے تھے اور اسی کی طرح بکریاں چُراتے تھے ..... مگر ایک دن ان کے ریوڑ کی بھی ایک بکری پاکستانی سرحد پر چلی گئی تھی اور وہ اسے لانے کے لئے وہاں چلے تو گئے تھے مگر واپس نہ آ سکے کیونکہ پاکستانی فوجیوں نے انہیں پکڑ لیا تھا اور پھر کچھ دنوں بعد گاؤں کی اسکول کے ماسٹر نے ایک اخبار میں پڑھ کر گاؤں والوں کو حیران کر دیا تھا کہ رامو کاکا کو ہندوستانی جاسوس ہونے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

دین محمد نے رفتہ رفتہ پاکستانی سرحد سے قریب ہوتی مونا کو دیکھا پھر بے تابانہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔

اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر پاکستانی سرحد کا جائزہ لیا۔ وہاں دور دور تک کوئی اسے نظر نہیں آیا تو اس نے پلٹ کر اپنے ریوڑ کی بکریوں کو دیکھا۔ بکریاں ممیاتی، چلاتی گھاس چرنے میں مصروف تھیں مگر ادھر مونا رفتہ رفتہ ہندوستان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دین محمد نے جلدی سے اسے آواز دی۔

''آ مونا آ ..... آ آ ..... چل آ آ آ ..... لے مونا آ آ آ .....''

اس کی آواز پر مونا رک گئی۔ اس نے سر گھما کر دین محمد کو دیکھا۔ پھر ہندوستانی سرحد کے خاردار تاروں کو دیکھ کر اس نے پاکستان کی طرف سر گھمایا۔ ادھر بھی خاردار تاروں کا سلسلہ ہی اسے دکھائی دیا۔ اس نے سر گھما کر پھر سے دین محمد کو دیکھا اور لائن آف کنٹرول پر اگی گھاس پر پھر منہ مارنے لگی۔

آخر کار دین محمد نے اپنی لاٹھی ہندوستانی زمین پر چھوڑ دی۔ خاردار تاروں میں گھس کر سرحد پار ہوا اور لائن آف کنٹرول پر اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔

وہ بے تابی، بے چینی اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پاکستانی سرحد پر نظریں دوڑاتا ہوا اپنے قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

بڑھتے بڑھتے وہ مونا تک جا پہنچا اور جلدی سے لپک کر اس کے گلے میں پڑی رسی پکڑ لی۔ اس کا رخ ہندوستان کی طرف کیا..... مگر..... وہ مونا کو لے کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں کی سرحدوں کی طرف سے گولیاں چل پڑیں۔

ایک گولی اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی۔ دوسری دل کے مقام پر پیوست ہوگئی۔ اس کے خون کے چھینٹے مونا کے سفید بالوں پر جا پڑے۔ مونا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

مونا پھر بدکی اور اپنے سفید بالوں پر دین محمد کے خون کے چھینٹے لئے لائن آف کنٹرول پر چیختی چلاتی اِدھر اُدھر بھاگنے لگی.....

□□

بند دروازہ

بائیس سالہ نظیرہ شیخ عدالت کے دروازے سے باہر نکلی۔ بندوق اور گن تھامے پولس جوانوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا..... چہرہ پشیمان..... اور کٹورا آنکھیں بھیگ بھیگ جانے کو بے تاب تھیں۔ اس کے قدم اس مخصوص انڈیکا کی طرف اس انداز سے اُٹھ رہے تھے جیسے وہ اپنا سب کچھ ہار کر موت کے دروازے کی طرف بڑھ رہی ہو۔

عدالت کا برآمدہ اور اس کے زینے طے کرتے ہوئے بہت سارے کیمروں کے فلیش اس کی طرف چمکے۔ بہت سے ٹی وی چینل والوں نے اسے کیمرے کا ہدف بنایا اور بہت سے اخبار نویسوں نے اس کی تصویر اتار کر اس سے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ خاموشی سے سر جھائے انڈیکا کار کی طرف بڑھتی رہی۔ پولس جوانوں کا گھیرا اس کے ساتھ ساتھ رینگتا رہا اور اس کے ذہن میں خود اس کی آواز گونجتی رہی۔

''جج صاحب! جب ہماری بیکری کو آگ لگائی گئی تھی تب میں اوپر تھی..... ٹیرس پر..... میرا پانچ سالہ بھائی راجو میرے ساتھ تھا..... بیکری دھڑا دھڑ جل رہی تھی..... لوگوں کے چلانے..... شور مچانے..... اور نعرے لگانے کی آواز میں سن رہی تھی..... مگر وہ لوگ کون تھے؟..... کن لوگوں نے بیکری میں آگ لگائی تھی؟..... میں دیکھ نہیں سکی تھی..... بالکل نہیں جانتی میں کہ وہ کون لوگ تھے؟..... اور یہ جو کرسٹا سیلواد ہے جج صاحب! یہ تو مجھے زبردستی یہاں لائی ہے روپیوں کا لالچ دے کر..... تاکہ میں یہاں آکر جھوٹا بیان دوں..... اور ہاں ایسا نہ کرنے پر اُس نے مجھے جان سے مروا دینے کی دھمکی بھی دی ہے..... جج صاحب!..... تاکہ ان بے گناہ لوگوں کو سزا ہو سکے اور اس کا.....''

''ایکس کیوزمی نظیرہ شیخ..... کیا آپ عدالت میں اپنے پچھلے بیان سے مکرنے کی وجہ بتا سکتی ہیں؟''

نظیرہ چونکی۔ اس نے دیکھا۔ وہ پولس جوانوں کے گھیرے میں تھی اور انڈین ایکسپریس کا رپورٹر

مائک لئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نظیرہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ یہ وہی رپورٹر ہے جس نے سب سے پہلے اس کا انٹرویو لیا تھا..... وکرم راٹھور نام تھا اس کا..... جس کے انٹرویو چھپنے کے بعد تو اس کے گھر پر انٹرویو لینے والوں کا تانتا سا بندھ گیا تھا۔

اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کس طرح سینہ تانے..... سر اونچا کئے جوشیلے انداز میں بکری جلانے والوں کے خلاف بولتی چلی جا رہی تھی.....

''وہ کتے لوگ..... سب کو پہچانتی ہوں..... سب کو..... جن جن لوگوں نے بکری جلائی تھی؟..... جس نے میرے ابا کے پیٹ میں ترشول گھونپا تھا؟..... کس نے انور چاچا کو مارا تھا؟..... اور کس نے نورا بھابی کو.....؟ سب کو پہچانتی ہوں میں..... اسے بھی..... جس نے رضیہ آپا کا پیٹ چیر کر اس کا بچہ نکالا تھا..... سب کو جانتی ہوں..... اور ہاں..... ان آٹھ حرامی لوگوں کو بھی..... جنہوں نے ایک کے بعد ایک میری سہیلی سائرہ کا رے..... ہاں..... سب کتوں کو پہچانتی ہوں میں..... سب کو صاحب..... سب کو''

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی تھی..... اسے فساد کے وہ سارے مناظر اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہے تھے..... جلتی ہوئی بکری..... شور مچاتے لوگ..... نعرے لگاتا ہجوم..... پیٹ میں گھونپے ترشول کو پکڑے دلخراش آواز میں چیختے ہوئے اس کے والد..... گردن کٹنے سے گرتے ہوئے انور چاچا..... بے لباسی میں اپنے ہاتھ پیر سمیٹے منت سماجت کرتی نورا بھابی..... چیرے گئے پیٹ کو بھول کر اپنی کوکھ سے نکالی معصوم جان کی طرف ہاتھ بڑھا کر زمین پر گر جانے والی رضیہ آپا..... اور آٹھ آٹھ ہوس کے درندوں کے درمیان گھری..... کھلونا بنی چیختی، چلاتی، بے ہوش ہو جانے والی ننگ دھڑنگ سائرہ.....

''میڈم! میں وکرم راٹھور! آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے پہلے کے بیان سے کیوں مکر گئی ہیں؟..... کیا آپ کو دھمکی دی گئی ہے؟..... یا پھر رشوت؟.....''

نظیرہ شیخ نے چونک کر وکرم راٹھور کو دیکھا..... اس نے دوبارہ سوال کر دیا تھا۔ نظیرہ نے اپنی بھیگی پلکیں جھکائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر کچھ کہے بنا ہی انڈیکا کی طرف بڑھنے لگی..... پولس جوانوں کا گھیرا اس کے ساتھ ساتھ انڈیکا تک آیا..... انڈیکا کا دروازہ کھلا..... اسے اندر جانے کا راستہ دیا گیا..... وہ اندر داخل ہوئی اور دھپ سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

گاڑی کا انجن جاگا..... گاڑی دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کورٹ کے احاطے سے باہر نکلی..... اور

تیز رفتاری کے ساتھ کورٹ سے دور ہونے لگی..... گاڑی کے شیشے تاریک تھے..... اس کی بھیگی آنکھیں ونڈ اسکرین سے باہر تک رہی تھیں..... تمام چیزیں بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں..... سڑک..... عمارتیں..... پول..... انسان..... گاڑیاں..... ہوٹلیں..... سبھی پیچھے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا ذہن بھی پیچھے کی طرف بھاگا.....

وہ کالج جانے کیلئے گھر سے نکلی۔ بازو کے گھر میں رہنے والی اپنی سہیلی سائرہ کو اس نے آواز دی۔

''چل اے سائرہ..... جلدی کر..... پونے بارہ بجنے کو ہے.....''

''ہاں آئی نظیرہ..... بس ایک منٹ..... یہ نورا بھابی نے میرا ایک سینڈل نہ جانے کہاں رکھ دیا ہے..... بتاؤ نا بھابی..... کہاں رکھا ہے سینڈل..... دیکھو نظیرہ کھڑی ہے نا..... مذاق مت کرو.....''

''میں کہاں مذاق کرتی ہوں.....''

''دیکھو بھابی..... ستاؤ مت نا..... دیر ہو رہی ہے کالج کو.....''

سائرہ کی منت سماجت سن کر نظیرہ مسکرائی..... اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ باہر ہی دیوار سے لگا کر رکھا سینڈل اسے نظر آ گیا.....

''دیکھا اے سائرہ..... یہ باہر رکھا ہے تیرا سینڈل..... اور بھابی تم کو بھی مذاق کرنے کیلئے یہی ٹائم ملتا ہے؟.....''

''اور نہیں تو کیا؟..... اب نند ہی سے تو مذاق کروں گی نا.....''

''ہاں ہاں ضرور..... منع کون کرتا ہے؟..... اچھا بھابی چلتے ہیں..... بائے..... چل نظیرہ.....''

''چلو بھابی..... بائے.....''

''بائے..... مگر سنو نظیرہ، سائرہ..... رام یاترا نکل رہی ہے..... تم لوگ ذرا جلدی گھر آ جانا..... آں.....''

''اچھا بھابی.....''

وہ دونوں معمول کے مطابق ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کالج کی طرف بڑھنے لگیں۔

گاندھی چوک پر پہنچ کر ایک راستے سے انہیں بہت بڑا جلوس اُدھر آتا دکھائی دیا..... خوب دھوم دھڑاکا ہو رہا تھا..... بینڈ بجائے جا رہے تھے..... ڈھول تاشے پیٹے جا رہے تھے..... گلال اُڑائے جا رہے تھے..... نعرے لگائے جا رہے تھے..... جنہیں سنتے ہوئے وہ دونوں کالج کی طرف بڑھ گئیں۔

شام کو کالج سے واپسی پر انہیں جگہ جگہ گلال بکھرے پڑے دکھائی دیے...... گاندھی چوک کے راستے بھی گلال آلود دکھائی دیے...... وہ دونوں گلال زدہ راستوں سے گذرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بڑھتی رہیں۔

گھر پہنچ کر نظیرہ نے اپنے کمرے کے ٹیبل پر کاپیاں اور پرس رکھا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ ذرا دیر سستانے کو بیڈ پر لڑھکی پڑی رہی اور پھر اٹھ کر ٹیرس کی طرف جانے والے زینے کی طرف چل دی۔

اُس کا چار سالہ بھائی راجو "آپی آپی" کہتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے اسے بڑھ کر اُٹھا لیا۔ اس کے دونوں گال چومے اور اسے گود میں لئے لئے ٹیرس پر جانے کیلئے زینہ چڑھنے لگی۔

ٹیرس پر پہنچتے ہی اسے نیچے سڑک سے اٹھتا شور سنائی دیا۔ اس نے ذرا اُچک کر دیوار پر سے نیچے جھانکا...... حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں...... ہزاروں لوگوں کا ہجوم ایک طرف سے بھاگا چلا آ رہا تھا...... ہجوم کے لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ...... تلواریں...... ترشول...... ہاکی...... بھالے...... اور تیل کی کین تھی۔

نظیرہ بیٹھ کر باریک جالی میں سے نیچے دیکھنے لگی...... اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پوری چال میں آگ لگا دی گئی...... اس کی بیکری کی دیواروں پر کرن اور مورے نے پٹرول چھڑکا...... پاٹھک نے آگ لگائی اور ہجوم "جے شری رام ہو گیا کام" کے نعرے لگانے لگا۔ راجو کے منہ سے چیخ نکلی ہی تھی کہ نظیرہ نے اس کا منہ دبا کر اسے خود سے لپٹا لیا اور دیکھا۔ اس کے والد کچھ کہنے کو آگے بڑھے تو اشوک نے اپنے ہاتھ کا ترشول پوری قوت سے ان کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ ترشول پکڑ کر بڑے دلخراش انداز میں چیخے اور پھر دھڑام سے زمین پر گر کر تڑپنے لگے...... انور چاچا اس کے والد کو سنبھالنے کو لپکے...... مگر سریش نے اپنی پوری طاقت سے ان کی گردن پر تلوار دے ماری...... ان کا سر کٹ کر ایک طرف جا گرا...... جس کے گرتے ہی کشور نے ایک ٹھوکر مار کر اسے بیکری کی آگ میں اُچھال دیا...... ان کا بے سر جسم سڑک پر گر کر تڑپنے لگا...... اور پھر رمیش اور دیپک نورا بھابی کو بالکل ننگی حالت میں گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لائے...... "جے شری رام...... ہو گیا کام" ...... کا نعرہ گونجا...... اور نورا بھابی کے برہنہ بدن کو بیکری کی آگ میں پھینک دیا گیا...... ان کی چیخیں نظیرہ کے کانوں سے ٹکرائیں...... اس نے آگ پر سے نظر ہٹائی ہی تھی کہ چیختی چلاتی رضیہ آپا پر اس کی نظر جا پڑی...... حمل سے تھی وہ...... ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ایک آدھ ہفتے میں ہی اس کی ڈلیوری ہونی تھی...... نندو اور شرما نے اس کے دونوں بازو جکڑ رکھے تھے...... راٹھور نے ایک نظر اپنے

ہاتھ کے تیز دھار چاقو کو دیکھا..... اور رضیہ آپا کا پیٹ چیر ڈالا..... رضیہ آپا چیخی..... مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس میں پرورش پاتی معصوم جان کو نکال کر ایک نظر دیکھا..... اور قہقہہ لگاتے ہوئے اسے آگ میں اُچھال دیا..... رضیہ آپا نے اپنی کوکھ کی اولاد کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دھڑام سے سڑک پر گر گئی..... اس کے گرتے ہی نظیرہ کے کانوں سے پھر نسوانی چیخیں ٹکرائیں..... اور اس نے دیکھا..... وکرم اور ونود سائرہ کو دبوچے ہوئے تھے..... وہ چلا رہی تھی..... کرن اور مورے اس کے بدن سے کپڑے نوچ رہے تھے..... اسے بے لباس کر کے چاروں نے بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر چیختی چلاتی سائرہ کی عصمت کا دامن تار تار کیا پھر اسے..... راہول..... پنکج..... آنند اور راکیش کے حوالے کر کے'' جے شری رام ہو گیا کام.....'' کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے..... سائرہ چیختی رہی..... ان کے شکنجوں سے آزاد ہونے کو تڑپتی رہی..... چلاتی رہی..... روتی رہی..... گڑگڑاتی رہی..... مدد کو پکارتی رہی..... اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز کمزور پڑتی ہوئی بند ہو گئی..... مگر راہول..... پنکج..... آنند اور راکیش نے اس کے بے سدھ ہونے پر بھی اپنا کام جاری رکھا..... اور پھر تھوڑی دیر بعد اسے چھوڑ کر چند لمحے اسے گھورتے کھڑے رہے..... ننگ دھڑنگ سائرہ چاروں خانے چت بے حس و حرکت پڑی رہی..... پھر ان لوگوں نے اسے گھورتے گھورتے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کر کے سائرہ کے ننگے اور بے سدھ بدن کو اٹھایا اور جلتی سلگتی بیکری کی آگ میں پھینک دیا..... اور نظیرہ اپنے چار سالہ بھائی راجو کا منہ دبائے بالکل بُت بنی حیرت سے منہ کھولے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سارے مناظر دیکھتی رہی..... چاروں طرف آگ جلتی رہی..... دھوئیں کے بادل اُٹھتے رہے..... اور وہ آنسو بھری آنکھوں سے فسادیوں کے ہجوم کو نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھتی رہی..... '' جے شری رام..... ہو گیا کام..... جے شری رام..... ہو گیا کام.....''

''چل اے لڑکی!''

نظیرہ چونکی..... انڈیکار کی ہوئی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا..... اس کا سات سالہ بھائی راجو باہر کھڑا تھا..... راجو کے پیچھے اس کے علاقے کا ایم ایل اے ایک بریف کیس تھامے کھڑا تھا۔

'' دیکھ اے..... یہ رہے اٹھارہ لاکھ روپے..... اور یہ رہا تیرا بھائی!..... اگر تو نے دوبارہ پھر کبھی کورٹ میں سچی گواہی دی..... تو یہ روپے تو جائیں گے ہی..... تیرے بھائی کے ساتھ ساتھ تو بھی جائے گی کام سے..... سمجھی؟..... جیسا کہا جا رہا ہے..... ویسا ہی کرتی جا..... فائدے میں رہے گی..... ورنہ..... یہ لے''

اتنا کہہ کر اس نے بریف کیس اس کی سیٹ پر پھینک دیا..... پھر راجو کو انڈیکا کے اندر کر کے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا..... انڈیکا نے یوٹرن لیا..... عمارت کے کمپاؤنڈ سے باہر نکلی..... اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی.....

نظیرہ کو اپنے اندر بھی کوئی چیز بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی..... کسی راستے کی تلاش میں..... اس کے بدن سے نکل باہر ہونے کیلئے بے تاب کوئی چیز اس کے اندر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''چلو میڈم!..... باہر نکلو..... آ گیا گھر تمہارا.....''

نظیرہ نے چونک کر دیکھا۔ ڈرائیور دروازہ کھولے عجیب سی حقارت اور ذلت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ راجو کو لے کر انڈیکا سے اتر گئی۔

''اور یہ کون لے گا؟.....''

ڈرائیور نے نوٹوں بھرا بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

نظیرہ چند ثانئے خالی خالی نظروں سے بریف کیس کو دیکھتی رہی پھر اسے لے کر اپنے گھر کے دروازے کے پاس رکھا اور دروازے پر پڑا تالا کھولنے لگی۔

دروازہ کھول کر وہ اور راجو بریف کیس کے ساتھ اندر داخل ہوئے..... اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کیا..... دروازہ اندر سے بند کیا اور پوری طاقت سے نوٹوں بھرے بریف کیس کو سامنے کی دیوار پر دے مارا۔

دیوار کا پلاسٹر اُکھڑا..... بریف کیس کھل گیا اور اس میں موجود نوٹوں کی گڈیاں باہر نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

بکھری نوٹوں کو پتھرائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ نیچے بیٹھی اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

''کیا ہوا آپی تم کو؟؟.....''

راجو نے پوچھا مگر جواب میں اس کی آنکھوں کا بند ٹوٹ گیا..... اس نے راجو کو جھپٹ کر اپنے گلے سے لگایا..... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... روتی رہی..... سسکتی رہی..... نوٹوں کی بکھری گڈیوں کو دیکھتی رہی..... بے تحاشہ روتی رہی..... اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو راجو کی شرٹ میں جذب ہوتے رہے..... راجو بھی رونے لگا..... اور روتے روتے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اس دروازے کو اپنی بھیگی آنکھوں سے دیکھتا رہا جسے کچھ دیر پہلے اس کی بہن نظیرہ شیخ نے بند کر دیا تھا۔

□□

ہمدرد

گرمی بڑی شدت کی تھی۔ سورج کی تپش نے جانوروں کو سائے میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں کے آس پاس شاخوں پر بیٹھے سورج کی تپش کم ہونے کے منتظر تھے۔ دھوپ کی تمازت نے بچوں کو گھروں میں ڈبکا رکھا تھا مگر وہ سات آٹھ سالہ معصوم سی خوبصورت بچی تپتی چلچلاتی دھوپ میں محوِ سفر تھی۔ اس کے پیچھے ایک ہجوم خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔ گاؤں سے شہر جانے والی شاہراہ پر اس کے ننگے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے جھلستے پیروں پر اس شاہراہ کو بھی ترس آ رہا تھا۔ مگر وہ سڑک کے رحمدل سینے پر اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ لوگوں کا ہجوم اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

جھلسی ہوئی دوپہر میں اس کا معصوم چہرہ مُرجھایا ہوا تھا..... اس کے چہرے پر پسینے کی چمکتی ہوئی بوندیں موتیوں سی دکھائی دے رہی تھیں..... اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں..... گال ذرا اندر کو دبے ہوئے تھے..... گرد آلود بال بکھرے ہوئے تھے..... اس کے بدن پر نیلے رنگ کا میلا کچیلا پیوند زدہ لباس تھا..... لیکن اس کے مُرجھائے چہرے پر اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی..... اور اس کے پیچھے آنے والے خاموش ہجوم کے قدم بھی آگے بڑھ رہے تھے۔

بچی اس ہجوم سے بے پرواہ آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ اچانک ہی ایک بڑا سا پتھر اس ہجوم سے آیا اور اس معصوم کے سر سے ٹکرا گیا..... وہ درد سے تلملا اُٹھی..... اس کے سر سے خون نکلنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ کر پیچھے مڑتے ہوئے اس مجمع کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا..... اور اپنے تپتے جھلستے سائے پر بیٹھ گئی۔

اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہو گئے..... اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ زار و قطار رونے

لگی..... وہ روتے روتے اپنے خون آلود ہاتھوں کو بار بار دیکھ کر مزید خون آلود کرتی رہی..... لوگوں کا ہجوم خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا.....

دفعتاً ایک ادھیڑ عمر والا آدمی بھیڑ سے نکلا..... منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھا..... روتی بلکتی بچی تک آیا اور بچی کے داہنے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا..... بچی اپنا گال سہلاتے ہوئے سسکیاں لے لے کر رونے لگی..... اس کا دایاں گال بھی خون آلود ہو گیا..... اور وہ اسے سہلاتے سہلاتے سسکیاں لے لے کر رونے لگی..... لوگوں کا ہجوم اسے روتے بلکتے دیکھتا خاموش کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہجوم سے ایک نوجوان نکلا..... روتی ہوئی بچی کے قریب گیا..... جھک کر اسے دیکھا..... اور اس کے دونوں بازوؤں پر زور سے چٹکی لے کر دوبارہ ہجوم میں جا شامل ہوا..... بچی تلملا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چٹکی لی جانے والی جگہوں کو سہلانے لگی..... اس کے رونے کی آواز بڑھ گئی..... اس کے دونوں بازو خون آلود ہاتھوں کو سہلانے سے خون آلود ہو گئے..... اس کے سر سے خون بہتا رہا..... اس کا دایاں گال خون سے رنگا رہا اور وہ آنسو بہاتی روتی رہی.....

اس کے تعاقب میں آنے والا مجمع خاموش تماشائی بنا رہا۔

چند لمحوں بعد ایک بوڑھا شخص مجمع سے نکلا..... بچی کے قریب آ کر بیٹھا..... اسے غور سے دیکھا..... اس کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی ہتھیلی کا خون صاف کیا..... ہتھیلی کے درمیان چار تلیں موجود تھیں..... پھر اس نے ہاتھ چھوڑ کر اس کا سیدھا پیر اٹھایا..... اس کے تلوے پر نظر ڈالی..... انگوٹھے کے نچلے سرے پر بھی چار تلیں اسے دکھائی دیں۔ بچی روتی ہوئی اسے حیرت سے دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ کھڑا ہوا اور پلٹ کر مجمع پر برس پڑا۔

"بے وقوف لوگ!..... کیوں اس معصوم بچی کو تکلیف دے رہے ہو..... تمہارے آباواجداد نے تو اس بچی کا بہت خیال رکھا تھا..... مگر تم لوگ اس پر اتنے ظلم کر رہے ہو..... اس کے ساتھ ہمدردی کی بجائے ایسا دردناک سلوک اختیار کر رہے ہو..... ارے ظالمو! تمہیں تو اس کی خدمت کرنا چاہئے..... مگر تم لوگ ایسی دُرگت بنا چکے ہو اس بیچاری کی..... دفع ہو جاؤ یہاں سے ظالمو!..... چلے جاؤ....."

بوڑھے کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر لوگوں کی وہ بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی اور وہاں صرف وہی دونوں رہ گئے۔

بچی نے رونا بند کر دیا تھا..... اس کی سسکیاں بدستور جاری تھیں۔ وہ بوڑھا شخص بچی کی طرف مڑا اور

پُر شفقت لہجے میں بولا.....

''آؤ بیٹی..... چلو میرے ساتھ..... یہ ظالم لوگ ایسے ہی ہیں..... چلو میرے ساتھ..... میں تمہاری مرہم پٹی کر دوں..... چپ ہو جاؤ..... چلو اٹھو..... رونا بند کرو..... اب تمہیں کوئی کچھ نہ کرے گا..... چلو اٹھو.....''

بچی اٹھی اور اس بوڑھے شخص کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دی۔

ایک پہاڑ کے دامن میں موجود بوڑھے کے گھر پہنچ کر بچی نے دیکھا گھر کے نام پر ایک گھانس پھونس کی جھونپڑی تھی..... وہ دونوں اس کے اندر داخل ہوئے۔

پندرہ بیس منٹ گذرنے کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ بچی کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی..... اس کے نیلے سوٹ پر سوکھے خون کے دھبے لگے ہوئے تھے..... گال اور بازوؤں پر لگے ہوئے خون صاف ہو چکے تھے..... اور وہ بوڑھا شخص اس کا ہاتھ تھامے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر بوڑھے نے اپنی اکھڑی سانسوں کے درمیان ایک بڑے سے کالے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹی..... اپنا..... اپنا سیدھا ہاتھ..... اس پتھر کو لگاؤ.....''

بچی نے بڑھ کر اپنا سیدھا ہاتھ جیسے ہی پتھر کو لگایا وہ خود بخود ہلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی پہاڑ سے نیچے لڑھکتا چلا گیا..... بچی سہم کر پیچھے ہٹ گئی..... کیوں کہ اسے پتھر کی جگہ ایک گول تاریک خلا نظر آ رہا تھا..... بوڑھے نے اس کی پشت پر ہاتھ پھر کر اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''ڈرو نہیں..... کچھ نہیں ہوگا..... آؤ..... چلو..... آؤ..... اور تین مرتبہ اس خلا میں تیز آواز میں بولو کہ جادو کا چراغ اوپر دے دو..... پھر اس کے بعد اپنا نام بھی تین مرتبہ کہو..... ہاں بولو..... ارے کچھ نہیں ہوگا تمہیں..... میں ہوں نا..... ہاں..... بولو''

وہ بچی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور ڈری سہمی آواز میں بولی۔

''جادو..... کا..... چرا..... غ..... او..... پر..... دے دو..... جادو کا..... چراغ..... اوپر دے دو..... جادو کا..... چراغ اوپر..... دے دو..... میرا نام..... اردو ہے..... میرا نام اردو ہے..... میرا نام اُردو.....''

مگر بچی کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی بوڑھے نے بڑی بے دردی سے اسے تاریک خلا میں دھکیل دیا۔ بچی کی زوردار معصوم چیخ خلا میں گونجنے لگی..... اور ایک جلتا ہوا چراغ بڑے پُر اسرار طریقے پر رفتہ رفتہ تاریک خلا سے اوپر آنے لگا..... جسے اوپر آتا دیکھ کر بوڑھے کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ □□

کمال

شہر کے ایم ایل اے کمال صاحب کی سفید چمچماتی ایئر کنڈیشن کار واپسی میں اسی سڑک سے گزر رہی تھی جس پر سے آدھا گھنٹہ قبل گذرتے ہوئے کمال صاحب نے ڈوبتے سورج کی دلفریبی دیکھی تھی اور اپنے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہہ دیا تھا۔

گاڑی رک گئی تھی..... اور کمال صاحب ڈوبتے سورج کی دلفریب شعاعوں میں مگن ہو گئے تھے..... ان کی گاڑی کے پیچھے ہارن بجاتی ہوئی بہت سی گاڑیوں کی قطار لگ گئی تھی..... اور جس ایچ ایم جنرل اسٹور کے سامنے صاحب کی گاڑی رکی تھی..... اس کے مالک نے انہیں کئی صلواتیں سنا ڈالی تھیں۔

کمال صاحب نے اس کی باتیں سن کر اف تک نہیں کیا تھا۔ بس جھک کر دوکان کا سائن بورڈ دیکھا تھا..... اور ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کو کہہ دیا تھا..... ڈرائیور ان کی اس حرکت پر شدید حیرت میں تھا کہ..... اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کسی نے صاحب کو برا بھلا کہا ہو..... اور صاحب نے اسے کچھ نہ بولا ہو۔

"ڈرائیور..... گاڑی روکو....."

کمال صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا..... اس نے گاڑی روک دی..... مگر جب اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو چونک پڑا..... کیوں کہ گاڑی اسی سڑک پر تھی جس سے گذرتے ہوئے صاحب نے ایچ ایم جنرل اسٹور کے سامنے گاڑی رکوائی تھی۔

اس نے شرقی سڑک کے کنارے کو دیکھا..... اسے پھر ایک دماغی جھٹکا لگا..... کیونکہ گاڑی ٹھیک ایچ ایم جنرل اسٹور کے سامنے سڑک کے مغربی کنارے پر کھڑی تھی..... وہ اسٹور اس وقت بند تھا.....

ڈرائیور ابھی حیران ہی تھا کہ کمال صاحب بولے۔

''..... جاؤ..... جا کر دیکھو..... وہ اسٹور کیوں بند ہے.....؟''

''اچھا صاحب!.....'' کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا..... باہر نکلا اور سڑک پار کر کے ایچ ایم جنرل اسٹور کے بازو والی کیسٹ کی دوکان پر جا پہنچا..... دوکان مالک سے اسٹور بند ہونے کے متعلق پوچھا۔ اس کا جواب سن کر کار کی طرف واپس آتے ہوئے اسٹور کے شٹر پر پڑے تالے کو بڑے غور سے دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر ہلا کر کار کی طرف بڑھ گیا۔

کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''کمال ہے صاحب..... اسٹور کے تالے پر تو سرکاری سیل لگی ہوئی ہے۔'' □□

بگولوں کے درمیان

سر پر چمکتے سورج کی تپتی چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لئے ہوا کے جھونکے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے..... کسی جھونکے کا گذر بستی سے دور چٹیل میدان میں کھڑے پیپل کی طرف ہوتا تو اس کی رفتار بڑھ جاتی اور وہ بھنبھناتا ہوا سر چھپانے کے لئے کسی دوسری جگہ کی تلاش میں بھاگنے لگتا۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے اس شخص کو ضرور دیکھتا جو اس درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے، من ہی من میں کالے جادو کا کوئی منتر الاپ رہا تھا..... اس کے چہرے پر ایک عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی..... سر پر ایک بھی بال موجود نہیں تھا..... بھنویں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں.....

ہوا کا ایک گرد آلود جھونکا اس سے ٹکرایا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں..... اس کی انگارہ آنکھوں میں موجود نیلی پتلیاں بڑی ڈراؤنی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی نظر چٹیل میدان کے جس حصے پر پڑی وہاں سے ایک بگولہ اٹھا اور ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہوا کے گرم جھونکوں کو اپنے ساتھ لپیٹتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان کی فضا گرد آلود ہو گئی۔

جب تھوڑی دیر بعد بگولے کا زور ٹوٹا اور مٹی کے ذرّات دھرتی کی طرف گرنے لگے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پشت بستی کی طرف تھی۔ اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

اس کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی اس کا سیاہ سایہ بھی آگے بڑھتا گیا مگر جیسے ہی وہ پیپل کے دھوپ آلود سائے سے باہر نکلا..... اس کا سیاہ سایہ اس سے الگ ہو گیا۔

اس نے سر گھما کر پیپل کے سائے میں رک جانے والے اپنے سائے کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیلی اور اس نے بستی کی طرف رخ کر کے اپنے قدم تیزی سے اٹھانے شروع کر دیئے۔

بستی میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر چند لوگوں پر پڑی۔ ان کے سائے چاند کے ہالے کی طرح روشن بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان روشن سائے والے لوگوں کے قریب سے گزرنے لگا۔

''ارے! اس کا تو سایہ ہی نہیں ہے!!''

اس کے کانوں سے کسی کی تعجب بھری آواز ٹکرائی۔ اس نے کن انکھیوں سے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ لوگ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے اپنی رفتار کم کر لی۔

''ہاں یار! واقعی سایہ نہیں ہے اس کا۔۔۔۔''

''سچ یار۔۔۔۔''

''مجھے تو یہ کوئی پہنچا ہوا آدمی لگتا ہے۔۔۔۔''

''کوئی بابا ہے یار وہ۔۔۔۔''

''مہاتما ہے وہ۔۔۔۔ مہاتما''

''ولی ہے کوئی ولی۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔''

''مہاپُرش ہے یار۔۔۔۔ مہاپُرش ہے وہ۔۔۔۔''

ان لوگوں نے اس کے متعلق اپنے اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کر دیئے اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ان سے دور ہونے لگا۔ سورج ان کے سروں پر چمکتا رہا۔

کچھ دنوں بعد اس کے بے سایہ قدم بستی سے باہر نکلے۔ روشن سائے والوں کا ایک ہجوم تھا اس کے پیچھے۔۔۔۔ بوڑھے، بچے، جوان، عورتیں، لڑکیاں سبھی اس کے پیچھے پیچھے بڑے ہی سعادت مندانہ انداز میں سر جھکائے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان تمام لوگوں کے روشن سائے انہیں کے ساتھ آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

اس وقت بھی سورج سر پر چمک رہا تھا۔۔۔۔ ہوا کے جھونکے شدت کی دھوپ سے پریشان ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس کے بے سایہ قدم جیسے ہی پیپل کے دھوپ آلود سائے کی طرف بڑھے۔ چٹیل میدان میں جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے بگولے اٹھے اور ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے پورے میدان کی فضا گرد آلود کر گئے۔

جب ان بگولوں کا زور ٹوٹا، مٹی کے ذرات دھرتی کی طرف گرنا شروع ہوئے تو اس بے سایہ شخص نے پیپل کے دھوپ آلود سائے سے باہر نکلنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

پیپل کے دھوپ آلود سائے سے اس کے قدم جیسے ہی باہر نکلے ایک سیاہ سایہ اس کے ساتھ چپک گیا۔ اس کالے سائے کو دیکھ کر کچھ لوگ چونکے ہی تھے کہ اس کا سیاہ سایہ قریب ہی کھڑے ایک نوجوان کے روشن سائے سے ٹکرا کر اسے سیاہ کر گیا۔

وہ نوجوان اپنا سایہ دیکھ کر بدکا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے سائے سے دور بھاگتے سبھوں کے روشن سائے تاریک پڑتے چلے گئے۔

اپنے روشن سائے کو تاریک پڑتا دیکھ کر وہ لوگ بپھرے اور ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار سمجھ کر آپس میں لڑ پڑے۔

وہ لڑتے رہے۔ زخمی ہو ہو کر جلتی تپتی زمین پر گرتے رہے۔ جب ان کی لڑائی کو کافی وقت گذر گیا تو اس نے پلٹ کر آپس میں ہی لڑنے والوں کو اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

وہ لڑائی میں کچھ اتنے مگن تھے کہ خود سے دور ہوتے ہوئے اسے دیکھ نہیں پائے۔

اس نے ان کے سیاہ سایوں کو دیکھا۔ اپنے کالے سائے پر اس کی نظر پڑی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس نے مسکراتے ہوئے چٹیل میدان پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ میدان میں جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے بگولے اٹھے۔ میدان کی فضا گرد آلود ہو گئی اور پیپل کے دھوپ آلود سائے کے آس پاس موجود لوگ لڑتے رہے۔ زخمی ہو ہو کر اپنے سیاہ ہو جانے والے سایوں پر گرتے رہے اور وہ ان پر دل ہی دل میں ہنستا بگولوں کے درمیان سے گزرتا ان سے دور ہوتا چلا گیا۔

□□

دوسرا تیر

پورے چاند کی روشنی میں اونچے اونچے وہ درخت عجیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ان درختوں کے درمیان گھرا بہت ہی وسیع وعریض رام مندر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔کروڑوں روپیوں کی لاگت سے تیار شدہ اس مندر کے باہر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اندر بھی بھگوا رنگ پینٹ کئے گئے تھے۔ مندر کی چھت سے لیکر فرش تک بھگوا رنگوں میں لپٹے ہوئے تھے۔یہاں تک کہ مندر کے وسط میں براجمان کی گئی رام کی بڑی سی مورتی بھی مکمل بھگوا رنگ کی تھی۔مورتی کے بدن سے لپٹی ہوئی دھوتی..... دھوتی کے بیل بوٹے..... گلے میں پڑی مالا..... کاندھے سے لٹکا ترکش..... ترکش کے تیر اور ہاتھوں میں موجود نشانہ سادھے ہوئے تیر کمان سبھی بھوا رنگوں میں لپٹے ہوئے تھے۔مورتی کے پاس ہی مندر کا پجاری بھگوا لبادہ پہنے ستون سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

وہ دن بھر سے رام پریمیوں کو رام کی پوجا کروا کروا کے..... رامائن کے اشلوک پڑھ پڑھ کر تھک چکا تھا اور اگر وہ مندر کا مین گیٹ بند نہیں کرواتا تو لوگ صبح تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے..... کیونکہ اس مندر کو بنانے کیلئے رام سیوکوں نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔

انہوں نے اس رام مندر کیلئے مضبوط سی تاریخی مسجد کو نیست و نابود کر دیا تھا..... جس کی وجہ سے پورے ملک میں فساد پھوٹ پڑا تھا..... کچھ لوگ مسجد توڑتے تو کچھ لوگ مندر توڑ ڈالتے..... اور ایک دوسرے سے بھڑ جاتے..... قتل و غارت گری..... لوٹ مار..... دنگا..... فساد..... آگ اور خون کی ہولی..... لاشیں..... آہیں..... کراہیں..... عصمت دری..... خون ریزی..... تباہی..... بربادی..... نفرت..... تعصب..... دھرم..... مذہب..... ان حالات میں جیتے مرتے پورے پچاس برس گذرے..... تب کہیں جا کر ان کا دھرم یدھ وجئی ہوا..... اور وہ رام مندر بنانے میں کامیاب ہوئے۔

اس روز اسی رام مندر کے افتتاح کا پہلا دن تھا..... رام سیوک پورے ملک سے وہاں جمع ہو کر رام پوجا کر کے اپنے رام پریمی ہونے کا ثبوت دے رہے تھے..... مگر جب مندر کا وہ پجاری رامائن کے اشلوک پڑھ پڑھ کر تھک گیا۔ اس کا ذہن اشلوکوں کی گردان کرتے کرتے تھکن کی سرحدیں پار کر گیا تو اس نے مندر کا مین گیٹ بند کروا دیا اور رام کی بڑی سی مورتی کے قریب موجود ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

رہ رہ کر اس کے ذہن میں رامائن کے اشلوک گونجنے لگتے..... اور وہ انہیں بار بار اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا..... کبھی کبھی کوئی اشلوک اس کی زبان سے پھسل بھی جاتا..... اور وہ سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنے ذہن سے اس اشلوک کو جھٹکنے کی کوشش کرتا۔

اسی طرح کچھ وقت گذرنے کے بعد اچانک ہی اس کے ذہن کے کسی کونے سے ایک معصوم سی چیخ ابھری..... اور پھر تو آہیں..... کراہیں..... اور چیخیں ابھرتی ہی چلی گئیں..... رامائن کے اشلوک پس منظر بن کر گونجتے رہے..... اور پھر..... رفتہ رفتہ اس کے ذہن کی اسکرین پر چیخنے چلانے اور آہیں بھرنے والوں کی تصویریں صاف ظاہر ہو گئیں.....

..... آگ اور خون کی ہولی..... قتل و غارت گری..... دنگے..... فساد..... لوٹ مار..... عصمت دری کے..... مختلف مناظر اس کے ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی طرح چل پڑے.....

انہیں مناظر کے درمیان سے ایک منظر اور ابھرا..... ایک جلوس..... بہت بڑا جلوس..... رام راج زندہ باد، کے نعرے لگاتا ہوا جلوس..... جلوس میں موجود تلواریں..... ترشول..... بھالے..... نیزے اور دیگر قسم کے ہتھیار لہرا لہرا کر نعرے لگانے والے لوگ..... ''رام راج زندہ باد..... رام راج زندہ باد.....''

اس نے سر جھٹک کر آنکھیں کھولیں۔ دو ایک بار اپنی بوجھل پلکیں جھپکیں اور رام کی مورتی کو دیکھا۔ مورتی پر نظریں پڑتے ہی اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''رام راج زندہ باد.....''

اس ایک جملے کے زبان سے نکلتے ہی اسے اپنے ذہن کے اندر ایک ہلچل سی محسوس ہوئی..... اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے دو ایک گہری گہری سانسیں لیں تو اسے اپنے چاروں طرف سے لوگوں کی آہیں، کراہیں اور چیخیں اُبھرتی محسوس ہوئیں..... انہیں چیخوں کراہوں اور آہوں کے درمیان سے ایک نعرہ اُبھرا.....

''راون راج مردہ باد.....''

اور گونجتا ہی چلا گیا.....

اسے لگا جیسے مندر کی اینٹ اینٹ سے نعرے کی آوازیں نکل کر اس کے کان کے پردوں کو ہلا رہی ہیں.....

''راون راج مردہ باد..... راون راج مردہ باد..... مردہ باد..... مردہ باد.....''

''نہیں..... راون راج نہیں ہے یہ..... رام راج ہے یہ..... رام راج زندہ باد..... رام راج زندہ باد.....''

مگر اس کی چیخ کا ان نعروں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نعرے بدستور جاری رہے۔

''راون راج مردہ باد..... راون راج مردہ باد..... مردہ باد..... مردہ باد''

وہ پھر چیخا.....

''رام راج رام راج..... رام راج زندہ باد.....''

مگر جواب میں ''راون راج مردہ باد'' کے نعرے ہی گونجتے رہے۔ نعروں کی گونج تھوڑی دیر برقرار رہی پھر اچانک ہی ایک بڑی بھلی سی آواز اسے سنائی دی۔

''ٹھہرو.....''

اس آواز کے ابھرتے ہی مکمل سکوت چھا گیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا.....

اس کی نظروں کے سامنے تیر کمان لئے رام کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے ان کے چرن چھو کر آشیرواد لینے کیلئے ہاتھ بڑھائے..... مگر رام نے اپنے پیر پیچھے کرتے ہوئے کہا.....

''پرے رکھو اپنے اپوتر ہاتھوں کو جو پاپ سے رنجت ہیں.....''

''رام جی..... میں نے تو رام راجیہ کیلئے یہ.....''

''نہیں..... تم نے رام راجیہ کیلئے نہیں..... راون راجیہ کیلئے سب کاریہ کئے ہیں..... رام راجیہ میں منشیہ کی ہتیا نہیں کی جاتی..... رام راجیہ میں منشیہ کو کاٹا نہیں جاتا..... رام راجیہ میں ناری پر اتیا چار نہیں کئے جاتے..... کنیا پر بلاتکار نہیں کیا جاتا..... بالک کو اگنی میں نہیں جھونکا جاتا..... رام راجیہ میں پریم کو نشٹ نہیں کیا جاتا..... پریم پوجا کی جاتی ہے..... پریم کا پرچار کیا جاتا ہے..... اسلئے تم اپنے اپوتر ہاتھ دور رکھو میرے چرنوں سے..... یدی تم نے میرے چرن چھو لئے تو میرے چرن بھی اپوتر ہو جائیں گے..... کیونکہ تم نے یہ سب کاریہ راون راجیہ کیلئے کئے ہیں..... راون راجیہ کے لئے.....''

اتنا کہہ کر رام غائب ہو گئے ..... مگر رام مندر کی دیواروں سے ''راون راج مردہ باد'' کے نعروں کا سیلاب امڈ پڑا اور اسے مندر کے در و دیوار ہلتے محسوس ہوئے ..... دیواریں ..... چھت ..... فرش ..... ستون ..... اور خود رام کی مورتی بھی ہلتی محسوس ہوئی ..... اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا دیواریں، چھتیں اور ستون دھڑ ادھڑ گرنے لگے۔

صبح جب تہس نہس ہو جانے والے رام مندر کے ملبے کو صاف کیا جانے لگا تو صفائی کرنے والوں کو مندر کے پجاری کی لاش رام کی مورتی کے پاس ہی پڑی ملی ..... اور لوگوں نے دیکھا کہ مردہ پجاری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی رام کی مورتی کو تک رہی ہیں۔ رام کے ہاتھوں کی کمان کا رخ اس کے سینے کی طرف ہے اور رام کے غضبناک چہرے کا تاثر دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے ..... جیسے وہ پھر کسی راون کے انت کیلئے دوسرا تیر چلانے والے ہیں .....

□□

اولڈ از گولڈ

سفید جنگلی کبوتر کی بات سے پورے جنگل میں بھونچال سا آ گیا۔اس کی بات جنگل کی آگ کی طرح پورے جنگل میں پھیل گئی۔تمام ہی چھوٹے بڑے جانوروں کو معلوم ہوگیا کہ ان کے پیارے سے اس جنگل میں موجود تالاب کے پانی کو چھوٹی چھوٹی سرنگی نالیوں کے ذریعے دوسرے جنگل میں لے جایا جا رہا ہے اور یہ کام خود جنگل کے نئے نوجوان راجا شیر کے حکم سے اس کے سپاہی چوہے کر رہے ہیں۔

اس بات پر ان کو بڑی حیرت ہوئی۔حیرت سے زیادہ دُکھ ہوا اور دُکھ سے بھی زیادہ افسوس خود انھیں اپنے آپ پر ہوا کیونکہ ان میں سے ہی بہت سے جانوروں نے نئی قیادت کا نعرہ بلند کیا تھا اور وہ نئی قیادت کا بھوت ہی تھا جس کی بدولت کئی دہائیوں سے جنگل پر حکوت کرنے والے بوڑھے شیر کو الیکشن میں شکست فاش ہوگئی۔

جنگل کے جانوروں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک نوجوان شیر کو بھاری اکثریت سے کامیاب کر کے جنگل کا راج اسے سونپ دیا مگر آج سفید کبوتر کی خبر نے تمام جنگلی جانوروں کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ان کا چنندہ وہ نیا راجا ہی خود ان کی زندگی پر سوالیہ نشان عائد کر رہا تھا۔

تمام جنگلی جانوروں کو تالاب کا مسئلہ اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ محسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ تالاب اس جنگل کا واحد تالاب تھا جہاں سے تمام ہی چھوٹے بڑے جانوروں کو پانی ملا کرتا تھا۔اگر اس تالاب کا پانی ہی دوسرے جنگل چلا جاتا تو اس جنگل کے تمام جانور پیاسے مر جاتے۔

اتنا سوچ اور سمجھ کر جانوروں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ جنگل کے پرانے راجا بوڑھے شیر کے رو برو یہ مسئلہ رکھا جائے کیونکہ جانوروں کی سوچ کے مطابق کوئی اور اس مسئلے کا حل نکال ہی نہیں سکتا تھا۔اس لئے اولڈ از گولڈ پر یقین کر کے جنگل کے تمام جانور ایک خاموش جلوس کی شکل میں بوڑھے شیر کی کچھار کی

طرف چل پڑے۔

کچھار کے پاس پہنچ کر بوڑھا خرگوش، تجربہ کار بیل اور سمجھ دار گینڈا آگے بڑھے تاکہ بوڑھے شیر کو تمام ہی جنگلی جانوروں کی آمد اور تالاب کے مسئلے سے آگاہ کریں۔

تینوں کچھار میں داخل ہوئے۔ بوڑھا خرگوش آگے تھا۔ درمیان میں بیل اور گینڈا پیچھے۔ کچھار کے باہر کھڑے تمام جانور بڑی امید بھری نظروں سے ان تینوں کو کچھار کے میں داخل ہوتے دیکھ رہے تھے ان تینوں نے ابھی دو چار قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ قہقہوں کی آواز سن کر ان کے قدم رک گئے۔

خرگوش نے پلٹ کر بیل کو دیکھا۔ بیل نے مڑ کر گینڈے کو اور گینڈے نے بیل کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر باہر کھڑے پرامید جانوروں کو دیکھ کر خرگوش کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

بیل اور گینڈا اپنی جگہوں پر رک گئے۔ خرگوش آگے بڑھا۔ اس کی نظر قہقہہ لگانے والے پر پڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود جنگل کا پرانا راجا بوڑھا شیر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں نئے راجا شیر کا ہاتھ تھا اور وہ اس نوجوان شیر سے کہہ رہا تھا۔

''جب آپ نے ففٹی ففٹی مال کی بات کہہ دی ہے تو سمجھ لیں کہ میں تالاب کے معاملے میں کچھ بھی نہیں بولوں گا۔ جنگل کے جانور جائیں بھاڑ میں۔''

□□

پلّا نے

میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام جمیل تھا۔ لوگ اسے ''پلّا نے'' کہتے تھے۔ اس نام سے وہ چڑتا بھی نہیں تھا۔ شاید وہ اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکا تھا۔ البتہ جب کوئی اسے اس کے اصل نام ''جمیل'' سے پکارتا تو وہ اجنبیت سی محسوس کرتا اور پکارنے والے کو حیرت سے دیکھتا۔ جس طرح اسے اپنے سائے کے وجود میں آنے کا علم نہیں تھا اسی طرح ''پلّا نے'' کے وجود میں آنے سے بھی وہ لاعلم تھا۔

پلّا نے بنا سنورا رہنے والا ایک ایم اے پاس نوجوان تھا۔ اس کی عمر ۲۷ برس کے قریب تھی۔ اس نے پونہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد نوکری کی بہت تلاش کی۔ بہت جوتے گھسائے مگر نوکری اس کے مقدر میں نہیں تھی۔

جب اسے ہر جگہ سے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا تو اس کے دونوں بڑے بھائیوں نے مل کر اس کے لئے ایک ریسٹورنٹ کا انتظام کر دیا۔ اس نے اپنے ریسٹورنٹ کا نام ''جمیل ریسٹورنٹ'' رکھا لیکن لوگ اسے ''پلّا نے ہوٹل'' کہنے لگے۔

پلّا نے ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھا گاہکوں کے آرڈر سنتا اور اپنے نوکروں کو ان کے آرڈر کی تکمیل کیلئے ہدایت دیتا رہتا۔

کوئی گاہک پکارتا۔

''پلّا نے..... اے پلّا نے.....''

''ہاں بھائی ''کہہ کر وہ دھیرے سے سر ہلاتا اور اپنے نوکروں میں سے کسی کو آواز دیتا۔

''دیکھ اے شیرو!..... دیکھ ادھر کیا چاہئے ان کو دے جلدی سے چل ''

پلّا نے کو کسی کی آواز سنائی دیتی'' سو گرام جلیبی دینا تو ذرا ''

وہ آہستہ سے سرہلاتا۔

''اچھا بھائی! ...... دیکھ اے شیرو! ...... شے ...... ابے اے رامو! چل ادھر پلاٹ پر سو گرام جلیبی دے ...... چل جلدی کر ......''

''پُلا نے ...... اے پُلا نے ...... دو سموسے بھجوا تو ذرا ......''

''اچھا بھائی! چل اے اکبر ...... اکبر ...... چل ادھر کرسی پر دو سموسے دے فٹ سے ...... میٹھا والا ...... چل فٹافٹ کر ......''

میں پُلا نے کے معمولات سے بھی خوب واقف تھا۔ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد ریسٹورنٹ کھولتا اور سیدھا کاؤنٹر پر جا بیٹھتا۔ کاؤنٹر کی مخصوص دراز کھول کر چھوٹی سائز کا قرآن نکالتا اور تلاوت کرنے لگتا۔ اس کے آدھا پارہ تلاوت کرنے تک اس کے تمام نوکر آ جاتے اور ریسٹورنٹ کی صاف صفائی میں جت جاتے۔

وہ ٹیبل کرسیاں صاف کرتے، لمبے لمبے اسٹول ان کی مخصوص جگہوں پر رکھتے۔ اس دوران چائے بنانے والا اسٹو جلا لیتا۔ پھر ایک بڑے سے بھگونے میں پانی بھر کر اسٹو پر چڑھا دیتا۔ پانی میں جلدی اُبال لانے کے لئے اسٹو خوب تیز کر دیتا تھا جس کی آواز ریسٹورنٹ میں گونجنے لگتی۔

اسٹو کی آواز کے ساتھ ہی کانچ کے گلاس اور فائبر کی پلیٹیں دھو دھو کر جست کے بڑے سے ٹرے میں رکھنے کی آوازیں بھی ریسٹورنٹ میں گونجنے لگتیں۔

ان آوازوں کے علاوہ نوکروں کی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی آواز بھی پُلا نے کے کانوں سے ٹکراتیں مگر وہ ان سے بے نیاز اپنی تلاوت میں مصروف رہتا۔

ایک پارہ پورا کر کے وہ قرآن بند کر کے اسے چومتا، آنکھوں سے لگاتا اور کاؤنٹر کی مخصوص دراز میں دوبارہ رکھ کر دراز بند کر دیتا۔

تھوڑی دیر گذرتی، اکا دکا لوگ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے لگتے اور پھر گاہکوں کا یہ سلسلہ وہی رات کے بارہ بجے ختم ہوتا۔ تب تک پُلا نے ان کے مختلف آرڈر سنتا اور ''ہاں بھائی ...... اچھا بھائی'' کہہ کر نوکروں کو آرڈر پورے کرنے کی ہدایت دیتا رہتا۔

صبح سے رات بارہ بجے تک اس کے کان کے پردوں سے گاہکوں کے آرڈر کے ساتھ ساتھ مختلف آوازیں بھی ٹکراتی رہتیں۔ کبھی سنجیدہ باتوں کی آوازیں تو کبھی بحث و تکرار کی، کبھی چھیڑ خانی کی تو کبھی ہنسی مذاق کی ...... ان آوازوں کو سن کر کبھی وہ زیر لب مسکراتا تو کبھی خود بھی گاہکوں کے مذاق میں شامل ہو جاتا۔

دن بھر میں اس کے دو ایک دوست بھی آ جاتے تو وہ ان کے لئے اپنے کاؤنٹر کے قریب ہی کرسی لگوا دیتا۔ ان کی دل کھول کر تواضع کرتا۔ ہنس بول کر ان سے باتیں کرتا اور خوشی خوشی انہیں رخصت کر دیتا۔ کبھی کبھی کسی سے خود جمعہ کے دن ملنے کا وعدہ بھی کر لیتا کیونکہ جمعہ کے دن اس کا ریسٹورنٹ بند رہتا تھا۔ اس بند کے متعلق بہت سے لوگوں کی طرح ایک مرتبہ میں نے بھی پُلّا نے کو سمجھایا تھا کہ وہ جمعہ کے روز ریسٹورنٹ بند نہ رکھا کرے کیونکہ اس روز بہت زیادہ دھندہ ہوتا ہے۔ میری اس بات پر پُلّا نے خوب زور سے ہنسا تھا اور میرا مشورہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو راجو بھائی! روزی روٹی اوپر والا دیتا ہے..... اگر وہ روزی دینے پر آ ہی جائے نا..... تو بدھ اور جمعرات کو بھی چھپر پھاڑ کر دیتا ہے..... یہ جمعہ وعہ سے کچھ نہیں ہوتا..... بس جس کے حصے میں جتنا لکھا ہوتا ہے..... اسے اتنا ضرور ملتا ہے.....''

پُلّا نے کی اس بات پر میں بھی دیگر لوگوں کی ہی طرح چپ ہو گیا تھا۔ کہتا بھی کیا۔ اس نے تو جواز کا ایک ہمالہ کھڑا کر دیا تھا میری زبان کے آگے جسے گرانا کم از کم میرے بس کی بات تو نہیں تھی۔

اتفاق سے اس روز بھی میں ریسٹورنٹ میں ہی تھا۔ میں پُلّا نے کے کاؤنٹر کے قریب والی میز پر بیٹھا تھا..... میرے دائیں ہاتھ میں چائے کا گلاس تھا..... تازہ اخبار میز پر پھیلا ہوا تھا..... میں اخبار پڑھتے پڑھتے چائے کی چسکیاں بھی لئے جا رہا تھا۔

ریسٹورنٹ میں لوگوں کی باتیں..... قہقہے..... ہنسی مذاق..... گپیں اور سنجیدہ باتیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونج رہی تھیں۔ اسٹو کی تیز آواز بھی اسی بھنبھناہٹ کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ میری طرح اخبار پڑھ رہے تھے۔ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے یا پھر اپنے سامنے رکھی پلیٹوں میں منگائی چیزیں صاف کر رہے تھے..... ریسٹورنٹ کے اس بھنبھناتے ماحول میں وقفے وقفے سے گاہکوں کی مختلف آرڈر دینے کی آوازیں پُلّا نے کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہ ہر آواز پر سر ہلا کر ''اچھا بھائی'' کہہ کر اپنے نوکروں کو ان کے آرڈر کی تکمیل کے لئے حکم دیتا جا رہا تھا۔

نوکر میزوں اور کرسیوں کے درمیان جلدی جلدی دوڑ بھاگ کر لوگوں کے آرڈر پورے کر رہے تھے۔ کانچ کے گلاس اور خالی پلیٹیں اپنے مخصوص انداز میں بجاتے ہوئے جست کے بڑے سے ٹرے میں لے جا کر تیزی سے رکھ رہے تھے اور وہاں انہیں دھو دھا کر ایک طرف سجاتے جانے والے اپنے ساتھی سے ایک آدھ جملے کا تبادلہ بھی کر رہے تھے اور گاہکوں سے وصول کئے گئے بل کاؤنٹر پر جمع کروا رہے تھے۔

میرے سامنے ہی ایک نوکر نے دس کا نوٹ لے جا کر کاؤنٹر پر پٹخا اور چلانے کے سے انداز میں کہا۔

''دس روپیہ۔'' اور اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ لئے ہوئے جست کے ٹرے کی طرف بڑھ گیا۔
چائے ختم کر کے میں نے سگریٹ سلگا کر جلتی ہوئی تیلی پلانے کے کاؤنٹر کی طرف اچھال دی اور اسے دیکھا۔ اس نے نوٹ اٹھا کر کاؤنٹر کی دراز کھولی اور نوٹ دراز میں رکھنے ہی جا رہا تھا کہ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ وہاں اکثر موٹر کاریں اور سواریاں رکا کرتی تھیں۔ لوگ ان سے اتر کر ریسٹورنٹ میں آ کر ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے اور اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ اس ٹیکسی کے بھی دروازے کھلے، مگر بہت تیزی سے..... آٹھ نو ہٹے کٹے افراد جلدی جلدی نیچے اترے اور ریسٹورنٹ کی طرف لپکے۔

''یو آر انڈر اریسٹ..... آئی ایم سیکریٹ برانچ آفیسر..... دس از مائی کارڈ.....''

آفیسر کی گرجدار آواز ریسٹورنٹ میں گونجی..... پلانے کے ہاتھ کا نوٹ دراز میں گرا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھتے چلے گئے۔

''دشمن ملک کے ایجنٹ ہونے کے جرم میں تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔''

آفیسر نے پھر کہا اور اپنی جیب سے ہتھکڑی نکال لی۔

ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف اسٹو کی تیز آواز ہی ریسٹورنٹ میں گونج رہی تھی۔

میں دھیرے سے اٹھا اور پُر وقار چال چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں دروازے تک پہنچا تو لوگوں کی کھسر پھسر مجھے سنائی دی۔

''پلانے اور ایجنٹ؟.....''

''وہ بھی دشمن ملک کا؟.....''

''نہیں یار..... وہ تو کتنا سیدھا لڑکا ہے.....''

''بہت شریف ہے.....''

''اور پانچ وقت کا نمازی بھی ہے.....''

''یقین نہیں آتا.....''

''ہاں! واقعی نہیں آتا یقین.....''

''کیا واقعی پلانے ایجنٹ ہے؟؟.....''

''کیا واقعی وہ ایجنٹ ہو سکتا ہے؟؟.....''

ان چہ میگوئیوں کو سن کر میں نے پلانے کے کاؤنٹر کی طرف دیکھا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ □□

بلیک اینڈ وہائٹ

فلم ''آج کا غنڈہ راج'' کے پہلے شو کی نمائش درمیان میں ہی روک دی گئی۔ سنیما ہال کے تمام لائٹ جلا دیے گئے۔ ہال میں موجود فلم بیں احتجاجاً ادھر ادھر کرسیاں پٹخنے لگے۔ سیٹیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ اس شور شرابے میں کچھ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ ان خاموش لوگوں میں وہ بھی تھا۔

چوبیس پچیس برس کا وہ نوجوان کالی پینٹ اور سفید شرٹ میں بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ گوری رنگت، درمیانہ قد اور مناسب صحت کے اس نوجوان کا نام خورشید تھا۔ خورشید یعنی سورج..... جو دنیا کو اندھیروں سے نجات دلا کر اجالوں کی سوغات دیتا اور دھنک رنگوں سے آشنا کرتا ہے..... مگر بیچارہ خورشید دھنک رنگوں سے ناآشنا تھا۔ اسے پہچان تھی تو صرف اور صرف سیاہ و سفید رنگوں کی جن کے بارے میں رنگوں کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کوئی رنگ ہی نہیں ہیں اور ان کا یہ خیال خورشید کی دنیا کو بے رنگی بنانے کے لئے کافی تھا۔

اس کی اس بے رنگی سے شہر کے اچھے اچھے ڈاکٹر پریشان تھے۔ کیونکہ سونوگرافی اور ایکسرے رپورٹ کے مطابق اسے ایسا کوئی بھی مرض نہیں تھا جس کی وجہ سے رنگوں کی شناخت ختم ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں کے عضلات ٹھیک ٹھاک کام کر رہے تھے۔ پھر بھی اس کی دنیا بے رنگی تھی..... دنیا کی رنگینی اسے بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ مختلف رنگ سیاہ اور سفید رنگوں کے ہلکے گہرے شیڈز میں تبدیل ہو کر اس کی آنکھوں تک پہنچتے تھے اور اسی لئے خورشید اکثر و بیشتر رنگوں کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

''..... یہ لال رنگ کیسا ہوتا ہے؟..... ہرا رنگ کیسا ہوتا ہوگا؟..... پیلا رنگ کیسا لگتا ہے؟ نیلا رنگ کیسا دکھائی پڑتا ہے؟..... پستہ رنگ کیسا نظر آتا ہے؟''

رنگوں کے جس قدر نام اسے سنائی دیتے۔ وہ افسوس بھرے انداز میں ان کے بارے میں سوچتا اور جب کبھی اسے اس بے رنگی کا احساس ہوتا وہ احساس کمتری کے ساتھ خدا سے شکایت کرتا اور دعا کرتا۔

''یا اللہ! یہ تو نے کیسا روگ لگا دیا ہے مجھے ..... اوروں کو تو یہ رنگ دکھائی دیتے ہیں ..... مجھے کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ ..... میرے مولا! ..... تو نے میری دنیا کیوں بے رنگی بنا دی ہے؟ ..... مجھے تو رنگ دکھا دے مولا ..... یہ لال پیلا ..... نیلا ..... گلابی ..... یا اللہ! مجھے بھی دکھا دے نارنگوں کو ..... مولا! ..... رحم کر ..... یا اللہ رحم کر مجھ پر ''

دل ہی دل میں دعا کرتے کرتے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

گذشتہ روز ہی اس کے پانچ سالہ بھائی راشد کے سر پر کسی ہمجولی نے پتھر مار دیا تھا جب وہ اپنا سر پکڑے گھر میں داخل ہوتا ہوا رو رہا تھا تو اسے دیکھ کر اس کی امی بے اختیار چیخ اٹھی تھیں .....

''ہائے اللہ! یہ تیرے سر میں کیا لگا ہے؟ ..... تیرا ہاتھ کیوں لال ہے؟ ..... بیٹا تو ذرا تیرا ہاتھ ..... یا اللہ خون ہے!! ..... کیا ہوا؟ ..... کیسے لگی؟ ..... بول نا بیٹا! ..... دیکھ تو خورشید اسے ''

خورشید اس وقت راشد کی تکلیف کو بھول کر خون کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

''خون ..... لال خون ..... خون لال ہوتا ہے؟ ..... مگر یہ لال کیسا ہوتا ہے؟ ..... لال خون کیسا ہوتا ہے؟ ..... کیسا ہوتا ہے یہ لال خون؟!! ''

لال خون کے بارے میں کچھ نہ سمجھ پانے پر اس نے راشد کے سر، ہاتھ اور شرٹ پر لگے خون کو دوبارہ دیکھا تھا۔ اس کے بالوں سے تھوڑا کم کالا تھا اس کا خون ..... جو اس کے بالوں پر تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر بال چپچپے ضرور دکھائی دے رہے تھے ..... البتہ اس کے گالوں، ہاتھوں اور سفید شرٹ پر بالوں سے ذرا کم کالے رنگ کا خون اسے نظر آ رہا تھا جسے دیکھ کر وہ پھر سوچنے لگا تھا .....

''خون لال ہوتا ہے ..... مگر لال خون کیسا ہوتا ہے؟ ..... یہ لال رنگ کا خون کیسا ہوتا ہے ..... کیسا نظر آتا ہوگا لال رنگ کا خون؟؟ ..... ''

صرف لال رنگ ہی کیا کوئی اور رنگ بھی کیسا ہوتا ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ سے اسی طرح بالاتر تھی جس طرح اس وقت اچانک ہی فلم کی نمائش روک دیئے جانا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ لوگ کرسیاں پیٹ رہے تھے ..... شور مچا رہے تھے ..... مگر وہ اس سلسلے میں تذبذب کا شکار ہی تھا کہ سنیما ہال کے ایک دروازے پر سنیما مالک نمودار ہوا اور تیز آواز میں بولا۔ لوگ خاموش ہو کر اس کی بات سننے لگے۔

''دیکھو! شہر میں فساد ہو گیا ہے..... آپ تمام لوگ ''

مگر اس نے آگے کیا کہا؟ لوگوں کے شور میں اسے سنائی نہیں دیا..... کیونکہ لوگ چیختے چلاتے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تھے..... جس کی جدھر سینگ سمائی، اِدھر ہی بھاگتا چلا گیا۔

خورشید بھی تیزی سے باہر نکلا..... سنیما کے باہر لوگ اسے بڑی بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے دکھائی دیئے..... وہ دوڑ کر ایک گروہ کے ساتھ ہو گیا.....

اس گروہ کے لوگ بھاگتے جا رہے تھے..... دوڑتے جا رہے تھے..... دوڑتے بھاگتے مختلف راستوں پر اِدھر اُدھر کٹتے جا رہے تھے..... کٹتے ہی جا رہے تھے..... لوگوں کے گروہ سے کٹتے جانے کا سلسلہ اس کے اکیلے رہ جانے پر ختم ہوا..... اور وہ اکیلا ہی ہانپتا کانپتا بھاگتا رہا..... دوڑتا رہا.....

خورشید اکیلا ہی سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں سے ہوتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس نے دوڑتے بھاگتے دیکھا تھا.....

..... بہت سی دکانوں کے دروازے توڑ کر انہیں لوٹ لیا گیا تھا..... شٹر توڑ کر انہیں برباد کیا گیا تھا..... جلا دیا گیا تھا..... کچھ کی آگ خود بخود بجھ چکی تھی..... کچھ دوکانوں کی آگ بجھ رہی تھی..... اور کچھ دوکانیں دھڑ ادھڑ جلی جا رہی تھیں.....

اگر خورشید ذرا رک کر غور کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ وہ ساری دوکانیں مسلمانوں کی ہی ہیں..... جنہیں چُن چُن کر لوٹا اور جلایا گیا تھا..... مگر اسے اس وقت بھاگنے اور اپنے گھر جا پہنچنے کے علاوہ اور کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا..... اور وہ ہانپتا کانپتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے وہ شاہی چوک پر ذرا دیر کو رکا۔ اس کی نظر شاہی مسجد کی دیوار پر جا پڑی۔ دیوار کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی..... کچھ چٹائیاں سڑک پر تو کچھ مسجد کے اندر جلی پڑی تھیں..... جن پر قرآن شریف جلی ادھ جلی حالتوں میں اِدھر اُدھر بکھرے دکھائی دے رہے تھے..... انہیں دیکھ کر خورشید نے تیزی سے چلتی ہوئی اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے شاہی مسجد سے متصل شنی مندر کو دیکھا..... وہ اپنی پہلی کی سی حالت میں صحیح و سالم کھڑا تھا.....

اس نے جلدی جلدی سانسیں لیتے ہوئے مسجد کو نقصان پہنچانے والوں کو ایک گندی سی گالی دی..... جبڑے بھینچے..... دو ایک گہری گہری سانسیں لیں..... اِدھر اُدھر دیکھا..... اپنی آستین میں چہرے کے پسینے کو پونچھا..... اور پھر اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔

دوڑتے دوڑتے اچانک اسے ایک موڑ پر رک جانا پڑا۔ وہ جلدی سے دو ایک قدم پیچھے ہو کر کونے والی شاپنگ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ آگے سڑک پر ایک ہجوم موجود تھا۔

ہجوم کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں..... جنہیں سننے اور سمجھنے کی وہ کوشش کر ہی رہا تھا کہ..... ایک تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی.....

''کون ہے سالا بول جلدی..... مسلمان ہے نا تو؟.....''

''ہاں!..... کیوں؟؟.....''

''چل پھر..... بول پھٹ سے..... جے رام جی کی.....''

''نن نن..... نہیں بولوں گا..... نہیں.....''

''مارو سالے کو..... مار ڈالو.....''

''کاٹ ڈالو!.....''

''اے نہیں..... ٹھہرو..... کوئی ضرورت نہیں مارنے کی.....''

خورشید نے ذرا جھانک کر دیکھا.....

ایک پولس انسپکٹر اپنا ڈنڈا ہوا میں لہراتا ہوا کہہ رہا تھا.....

''اسے مارنے کا حق قانون نے کسی کو نہیں دیا ہے... ہاں تو تو مسلمان ہے نا؟.....''

''ہاں صاحب!''

''چل جلدی سے جے رام جی کی بول دے..... نہیں تو پھوکٹ میں مارا جائے گا تو.....''

''نہیں بولوں گا نہیں بولوں گا!!..... مر جاؤں گا پر نہیں بولوں گا.....''

''ایسا..... نہیں بولے گا؟..... تو یہ لے.....''

''ٹھائیں.....''

گولی چلنے کی آواز سن کر خورشید نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور دیکھا سڑک پر ایک انسان پڑا تڑپ رہا تھا جسے تڑپتا دیکھ کر انسپکٹر نے اس کے سر پر ایک ٹھوکر ماری..... اپنا ریوالور والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور بولا.....

''سالا حرامی..... مسلمان کہیں کا..... جے رام جی کی.....''

''جے رام جی کی.....''

''جے رام جی کی.....''

لوگوں کا وہ ہجوم نعرے لگاتا ہوا آگے جانے لگا۔ ہجوم کے ہاتھوں میں ترشول، بھالے، تلواریں، گپتیاں، لاٹھیاں اور ڈنڈے خورشید کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ واپس مڑا اور راستہ بدل کر اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا اور ایک مسلم علاقے میں پہنچ گیا..... چونکہ اسے اپنی ماں کی فکر تھی کہ اس ماحول میں اس کے گھر نہ رہنے سے اس کی ماں پر کیا گذر رہی ہوگی۔ یہی سوچ کر اس نے کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا..... بس بے تحاشہ بھاگتا رہا..... مگر جب وہ آزاد چوک پر پہنچا تو ٹھٹھک گیا..... کیونکہ وہاں موجود ہنومان مندر صحیح وسالم کھڑا تھا..... اور..... اس کے پاس پولس کی ایک بھاری جمعیت اس کی حفاظت کے لئے کھڑی تھی۔ وہ ایک گلی میں مڑ کر بھاگنے لگا..... تھوڑی دور بھاگنے کے بعد ایک چھوٹے سے میدان میں لوگوں کا ایک ہجوم دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے اپنے دوڑتے قدم روکے اور سُن گُن لینے لگا۔ ہجوم سے آواز آئی۔

''نہیں سالا..... توڑ ڈالیں گے مندر کو.....''

''ہاں!..... ہنومان مندر توڑنا ہے.....''

''بے وقوفی مت کرو تم لوگ..... وہاں پولس موجود ہے..... کیسے توڑو گے؟''

''بس..... جیسے بھی.....''

''مگر کیا ملے گا اسے توڑ کر؟.....''

''ان کو کیا ملا مسجد توڑ کے؟..... تم کیوں منع کرتے ہو؟.....''

''ہاں تم کون ہوتے ہو منع کرنے والے؟.....''

''ہٹ جاؤ..... جانے دو ہم لوگوں کو.....''

''نہیں ہٹوں گا..... نہیں جانے دوں گا غلط کام کرنے جا رہے ہو تم لوگ.....''

''ابے بڈھے کو ہٹا.....''

''مار سالے کو.....''

''ہاں مارو.....''

خورشید نے جھانک کر دیکھا۔ وہ ہجوم ایک بوڑھے کو پیٹ رہا تھا۔ خورشید نے اپنا راستہ بدلا اور دوسری گلی سے بھاگتے ہوئے گذرنے لگا.....

وہ سڑک پر نکلا۔ اس نے سر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ جگہ جگہ سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اٹھتے دکھائی دے رہے تھے..... اس کا دل دہلا رہے تھے اور وہ بھاگ رہا تھا اسے فکر تھی کہیں اس کی امی اس دنگے فساد کے ماحول میں اس کی تلاش میں نہ نکل پڑیں..... اس کے ابو کے انتقال کے دو برس گذرنے کے بعد وہی تو ایک ماں کا سہارا تھا۔ راشد تو ابھی چھوٹا تھا اور اگر اس کی امی اس کی تلاش میں نکل جاتیں اور انہیں کچھ ہو جاتا تو؟؟..... بس یہی سوچ کر وہ کہیں رُک نہیں رہا تھا..... اپنی اُکھڑی سانسوں کے ساتھ ہانپتے ہوئے بھاگا چلا جا رہا تھا..... پسینہ پونچھ رہا تھا اور اپنی بلیک اینڈ وہائٹ نظروں سے چوکنا انداز میں اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

دوڑتے بھاگتے وہ پھر ہندو علاقے میں داخل ہو گیا۔

''یہ ایریا پار کرتے ہی اپنا محلہ آ جائے گا.....''

اتنا سوچ کر وہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ وہ دوڑتے بھاگتے گلی کے نکڑ سے نکلا ہی تھا کہ دوسری گلی سے نمودار ہونے والے ٹولے نے اسے دیکھ ہی لیا۔ وہ جان توڑ کر بھاگا۔ بے تحاشہ بھاگتا چلا گیا۔ وہ ٹولہ اس کے پیچھے ''جے رام جی کی..... جے بجرنگ بلی'' کے نعرے لگاتا چلا آ رہا تھا۔ ٹولے کے لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے، لاٹھی، باکی، تلواریں، گپتیاں، ترشول، چاقو، بھالے اس نے دیکھ لئے تھے اور اسی لئے ان سے بچ نکلنے کیلئے وہ ایک گلی میں پلٹ گیا۔

گلی میں پلٹتے ہی اسے رک جانا پڑا۔ ادھر سے دوسرا ٹولہ بھاگا چلا آ رہا تھا۔ دونوں ٹولے والوں نے اپنے درمیان خورشید کو گھبراتے، ہانپتے دیکھ کر ''جے رام جی کی''، ''جے بجرنگ بلی'' کے نعروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کیا اور خورشید کو چاروں طرف سے گھیر کر اپنا گھیرا تنگ کرنے لگے۔

خورشید ہانپتے ہانپتے اپنی بلیک اینڈ وہائٹ نظروں سے گھیرے کو تنگ ہوتا ہوا دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے سر کی پشت پر باکی سے زوردار وار کر دیا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔

''یا اللہ!.....''

کہہ کر اس نے درد کی شدت سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں..... مگر جب اس نے ہاتھ آگے لا کر آنکھیں کھولیں تو گھبرا گیا۔ اس کے ہاتھ عجیب رنگ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر اپنے اطراف دیکھا۔ اسے گھیرے ہوئے لوگوں کے کپڑے عجیب و غریب رنگت اختیار کر چکے تھے۔ اس کی نظر پاس ہی موجود ایک پیپل کے درخت کی طرف اٹھ گئی۔ درخت کا رنگ بھی

عجیب ہی رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس کے گھروں کو دیکھا اور پھر ان لوگوں کو دیکھا جو اسے گھورتے ہوئے گھیرے کھڑے تھے۔ رنگ سبھوں کے تبدیل ہو چکے تھے..... سارے ہی رنگ عجیب وغریب رنگت اختیار کر چکے تھے۔ اس نے سوچا.....

''کیا میں رنگ دیکھ سکتا ہوں؟..... کیا مجھے بلیک اینڈ وہائٹ مرض سے نجات مل چکی ہے.....؟''

اتنا سوچتے اور سمجھتے ہی اس نے فرط مسرت سے ایک لمبی سانس کھینچی اور شکر گزار نظروں سے آسمان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھٹ جانے والے سر کے درد کو بھول کر وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

''یا اللہ..... تیرا شکر ہے..... تو نے اچھا کر دیا مجھے..... شکر ہے مولا..... شکر''

..... مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید شکریہ ادا کرتا اسے گھیرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک ساتھ کئی گپتیاں اور کئی تلواریں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اس کے منہ سے فلک شگاف چیخ کیساتھ ہی بلیک اینڈ وہائٹ مرض سے نجات پانے والی آنکھوں سے دو قطرے نکلے اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

□□

ذکر اُس پری وش کا

''سالا..... یہ بارش کو بھی ابھی ہی شروع ہونا تھا.....''

''کیوں بھائی! تم ایسا کیوں کہتے ہو؟..... بارش شروع ہونے کا کوئی ٹائم پھکس ہے کیا؟''

''اے بھائی! میرا مطلب ہے..... مگر چھوڑنا..... میں کچھ بھی بولوں بولنے کو..... تیرا کیا جاتا ہے اس میں آئیں؟.....''

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں بولتے..... یہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ ہم انسان بارش کے تعلق سے کچھ کر بھی تو نہیں سکتے نا..... نہ یہ ہماری مرضی سے ہوتی ہے اور نہ رکتی ہے.....''

''ہاں بابا..... ٹھیک بولا تم نے..... مگر سالا یہ نسہ وسہ بھی تو کوئی چیز ہے نا..... یہ پانی کی وجہ سے میرے دوست لوگ ادھر تھوڑی آئیں گے..... پھر چرس کدھر ملے گا؟..... وہی لوگ تو ساتھ لاتے ہیں.....''

''اس کا مطلب تم چرس پیتے ہو اتنی سی عمر میں..... مجھے دیکھو تم سے دس پندرہ سال بڑا ہوں..... کوئی بھی نشہ نہیں کرتا..... اور تم اٹھارہ بیس سال کے ہو کے چرس پیتے ہو!.....''

''ہاں بیٹا!..... بری بات ہے..... کیوں پیتے ہو؟.....''

''دیکھو بابا!..... دیکھ بھائی!..... میں مانتا کہ نسہ بری بات ہے مگر کیا کرنا سالا..... ایک بار لت لگ گئی تو چھوٹتی ہی کہاں ہے؟..... میں ایک ہی بار پیا تھا..... اس کے بعد تو لت پڑ گئی ہے..... اب کیا بولنا تم دونوں کو..... دل بھی تو کوئی چیز ہے نا..... مگر سالا یہ بارس..... اے بھائی..... تو ذرا ادھر کو آ جا..... نہیں تو بھیک جائے گا پھوکٹ میں..... کیا گجب بارس ہو رہی ہے باپ.....''

''ہاں نا..... اور اچانک ہی شروع ہوئی تھی..... میں اپنے گاؤں کی خالہ کے گھر سے لوٹ رہا تھا.....

اس کھنڈر تک آیا ..... اور اچانک ہی بارش شروع ہوگئی ....."

"ہاں بیٹا ..... میں تو ایک مسافر ہوں ..... ادھر اُدھر پھرتا ہی رہتا ہوں ..... بارش سے ذرا پہلے یہاں سے گذرا تھا ..... اچانک بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں ..... بستی تو دور ہے ..... مجبوراً پلٹ کر ادھر ہی آنا پڑا ....."

"اور اپنا تو ٹائم پھکس ہے بھایا ..... اپنے دوست لوگ کے ساتھ میں ادھر ہی رہتا ہوں یہ ٹائم ..... اسی کمرے میں ....."

"یہ کمرہ! ..... کمرہ کہاں ہے بھائی! ..... آدھی چھت ٹوٹی ہے ..... پانی اندر بھر رہا ہے ..... وہ تو اچھا ہوا زمین ادھر کی ذرا اونچی ہے ..... ورنہ ہم لوگوں کو ابھی پانی میں ہی کھڑے رہنا پڑتا ..... او بابا ..... تم ذرا ادھر آ جاؤ میں دروازہ بند کر لیتا ہوں ..... بوچھاڑ ادھر ہی کی ہے ..... یہ کھلا رہا تو ہم تینوں بھیگ جائیں گے ..... اور دیکھو تو ..... باہر کتنا اندھیرا ہے ....."

"ہاں بھائی ..... ادھر اندھیرا ایسا ہی رہتا ہے ..... جب وہ اُدھر کھمبے کا لائٹ جلے گا نا ..... تب یہاں اجالا آئے گا ....."

"حالانکہ سورج تھوڑی دیر پہلے ہی تو ڈوبا ہے بیٹا ..... مگر جیسے لگتا ہے آدھی رات گزر گئی ہے ....."

"اور یہ پانی بھی تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا ..... اب کیا کرنا چاہئے؟"

"ہاں بیٹا ..... کیا کرنا چاہئے ....."

"اے بھائی ..... کیا کرنے ورنے کا ..... بات کرنے کا ..... تو ہے ..... میں ہوں ..... یہ بابا ہیں ..... مست بات کرتے رہنے کا ..... ٹائم پاس کرنے کا ..... کوئی کہانی وہانی سنانے کا ..... ایک دم پھنٹاسٹک والی ....."

"ہاں بابا! ..... یہ بھائی ٹھیک بولتے ہیں ..... آتی ہے تمہیں کوئی اچھی سی کہانی؟"

"ہاں بابا! ..... بولو نا ..... ایک آدھی کہانی ....."

"آج چھی بات ہے بیٹا ..... مگر تم نے وہ غالب کا یہ مصرعہ سنا ہے؟ ....."

"کون سا مصرعہ بابا؟ ....."

"وہی ..... ذکر اس کا پری وش کا ..... اور پھر بیاں اپنا ..... سنا ہے؟"

"ہاں بابا ....."

''اور تم نے بیٹا؟......''

''او بابا...... یہ گالب والب...... بسرا دوسرا مجھے نہیں مالوم...... تم کہانی بولو...... مگر وہ تم نے ابھی کیا بولا تھا نا پری وری...... ایسا کچھ تو بھی......''

''ہاں...... پری وش......''

''اس کا مطلب؟؟؟......''

''اس کا مطلب پری جیسے چہرے والی...... پری جیسی خوبصورت......''

''یانی؟...... سمجھ گیا میں...... وہ اپنی ایسوریہ اور سسمتا جیسی نا بابا......''

''نہیں بیٹا...... ان سے بھی خوبصورت''

''اچھا!......''

''ہاں تو بابا تم آگے تو کہو...... ہم لوگ سن رہے ہیں تمہاری باتیں...... وہ تو اچھا ہوا مجھے کوئی کام نہیں ہے گھر پر...... ورنہ اس بارش نے تو پھنسا ہی لیا تھا......''

''اے بھائی...... تیرا کام وام ایک طرف رکھ نا...... بولنے دے نا کہانی بابا کو...... ہاں بابا بولو...... وہ دیکھو جل گیا لائٹ کھمبے کا......''

''ہاں بیٹا! آ رہی ہے یہاں بھی روشنی...... ہاں تو سنو جب میں تمہارے جیسا جوان تھا نا...... تب میں نے ایک خواب دیکھا تھا......''

''کیا؟......''

''ایک لڑکی تھی...... عجیب سی لڑکی تھی وہ...... بہت ہی نازک...... بڑی حسین، بڑی ہی دلکش...... بے حد خوبصورت اور اتنی خوبصورت کہ آج بھی اس کی صورت نہیں بھول پا رہا ہوں...... اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے آسمان سے کوئی حور یا اپسرا اتر آئی ہو...... اور اس کی آواز...... آواز تو جیسے جلترنگ بجتے تھے...... اور میں گاؤں گاؤں شہر شہر اس کے دیدار کی تمنا میں بھٹکتا رہتا ہوں......''

''مگر بابا! تم خواب کی بات کرتے ہو...... میں نے ایک ایسی ہی لڑکی حقیقت میں دیکھی تھی کل......''

''کیا بات کرتے ہو بیٹا......؟''

''تو مجھے کیا دیکھتا ہے...... آگے بول نا...... سنتا ہوں میں تیری بات......''

''ہاں تو جب میں نے اسے دیکھا تھا نا...... تب میرے آس پاس میرے کئی ایک شناسا اور جگری

دوست بھی موجود تھے..... چند ایک لڑکیاں بھی تھیں..... مگر یقین مانو میں اس لڑکی کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا اور بہت دیر تک گھور گھور کر دیکھا تھا اسے..... حالانکہ وہ لڑکی میرے اس طرح گھور گھور کر دیکھنے سے شرما رہی تھی..... بے چینی محسوس کر رہی تھی یا پھر کچھ اور..... مجھے اس بات کا قطعی ہوش نہیں تھا..... اور....."

"یعنی مدہوش ہو چکے تھے تم....."

"ہاں بابا! میں اس کے ملکوتی حسن میں کھو سا گیا تھا..... اور آج بھی میرے ذہن پر اس کی تصویر نقش ہے..... میں کل پھر اسے دیکھوں گا جا کر..... میرے دوستوں نے اس کا اتہ پتہ کل ہی مجھے بتا دیا تھا..... مجھے ایسا لگتا ہے اسے دیکھے بغیر جی ہی نہیں پاؤں گا میں..... اور....."

"مگر اپنا تو میٹر ہی الگ ہے....."

"مطلب؟؟....."

"کیا میٹر ہے بیٹا..... تمہارا؟....."

"میں نے بھی ایک لڑکی کو دیکھا تھا..... برسوں پہلے..... سفر میں نظر آئی تھی وہ..... ایسوریہ اور سُسمتا تو اس کے سامنے کدھر بھی نہیں لگتے..... کیا گجب تھی بابا وہ..... ایک دم پھنکا سٹک..... لال لال ٹماٹر جیسی..... اور سالا اس کا چوکھٹا..... اس کا چوکھٹا تو جب بھی یاد آتا ہے نا..... میرے مستک میں بس ایک ہی گانا گھومتا ہے....."

"کون سا گانا.....؟؟"

"ارے وہی..... اپنے کسور دا کا..... وہی گانا..... آتے جاتے کھوبسورت آوارہ سڑکوں پہ..... کبھی کبھی..... اتفاق سے..... کتنے حسین لوگ مل جاتے ہیں..... ان میں سے کچھ لوگ بھول جاتے ہیں..... کچھ یاد رہ جاتے ہیں..... آتے جاتے کھوبسورت....."

"مگر بھائی! تم تو گانا ہی گانے لگے....."

"آں..... کیا؟..... کیا ہوا؟....."

"تم تو گانا ہی گانے لگے بیٹا..... آگے تو بولو..... پھر کیا ہوا؟....."

"ایسے ہی ہوتا ہے بابا ایسے ہی..... سالا اس کو بھول ہی نہیں پاتا ہوں میں....."

"اور میں بھی کل والی لڑکی کو بھول نہیں پا رہا ہوں....."

"میں بھی تو..... اس خواب والی لڑکی کی یاد میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہوں بیٹا"

''حالانکہ ..... جب میں نے اسے دیکھا تھا ..... برس گجر گئے ..... سالا اپنے دوست لوگ کے ساتھ میں بس میں چڑھا تھا ..... اندر بیٹھنے کو جگہ نہیں تھی ..... ہم سب کھڑے تھے ..... تھوڑی دیر بعد نا بس نے اسٹاپ کیا ..... لوگ اُترے ..... سیٹ کھالی ہوئی تو وہ ایک موٹی سی عورت کے باجو سے بیٹھ گئی ..... اور میں کھڑا سوچتا رہا ..... سالی وہ موٹی عورت اٹھے تو میں بیٹھوں اس کے باجو سے ..... ایک آدھ بات وات کر لوں اس سے ..... مگر کیا بولنا ..... اس کی ماں کی ..... سالی وہ عورت اٹھی نا ..... تو میرا ایک دوست بیٹھ گیا اس کے باجو سے ..... اس کی بھین کی تو ..... کیا بولنا ..... میں جرا اس کے باجو سے بیٹھ لیتا ..... دو ایک بات کر لیتا ..... اس کا اتا پتہ مالوم کر لیتا ..... مگر کیا بولنا ..... سالے میرے دوست نے سب لوچا کر دیا ..... کیا بھولی بھالی لگتی تھی بابا وہ .....''

''بھولی تو میرے سپنے والی بھی تھی۔''

''اور وہ بھی معصوم اور بھولی سی تھی بابا ..... جسے میں نے کل دیکھا تھا ..... کیا گلابی گلابی ہونٹ تھے اس کے .....''

''ہونٹ تو میرے سپنے والی کے بھی گلابی تھے ..... ایک دم ماڈرن لگ رہی تھی وہ بیٹا ..... سفید ٹی شرٹ اور ہری جینس پینٹ میں .....''

''بابا میں نے کل جسے دیکھا تھا ..... وہ بھی سفید ٹی شرٹ اور ہری پینٹ ہی پہنے ہوئے تھی ..... اور .....''

''کہیں اس نے گلے میں زعفرانی دوپٹہ تو نہیں لٹکا رکھا تھا بیٹا؟ .....''

''ہاں بابا ..... تھا .....''

''اے بھائی ..... او بابا ..... تم لوگ اپنی والی لڑکی کی ڈریسنگ کی بات کرتے ہو کہ میری والی .....؟''

''مطلب؟ .....''

''مطلب بیٹا؟ .....''

''ارے مطلب! ..... کیا وہ بھی ایسا ہی کپڑا پہنے تھی؟ .....''

''او ..... اے بھائی ..... او بابا ..... کہیں ہم تینوں ایک ہی لڑکی کے تو شکار نہیں؟''

''پتہ نہیں بیٹا .....''

''اور میرے کو بھی نہیں معلوم ..... ہاں اتنا معلوم ہے کہ اس کو بھول نہیں پاتا میں''

''میں بھی تو .....''

''اور میں بھی بیٹا..... ارے..... دیکھو..... کیا بارش دھیرے ہو گئی ہے؟.....''

''ہاں بابا..... مگر یہ کار کی آواز کیسی ہے؟.....''

''دیکھو تو ذرا دروازہ کھول کے..... مگر پورا مت کھولنا.....''

''ہاں بابا..... ارے..... بابا..... اے بھائی ادھر آ تو..... یہ دیکھ کار ادھر کھنڈر میں کیا کرنے آئی ہے..... اور یہ سالے کار بھی بند نہیں کرتے..... کچھ لپھڑا نہ ہو.....''

''ہاں..... کار کی لائٹ بھی جل رہی ہے..... ارے..... وہ تو کار سے اتر رہے ہیں..... چار لوگ ہیں وہ..... دیکھو بابا.....''

''ہاں بیٹا..... مگر پانچواں بھی کوئی ہے..... کوئی لڑکی ہے شاید.....!''

''ہاں..... وہ لڑکی ہے..... سفید ٹی شرٹ ہے اس کی..... پینٹ گرین..... اور دوپٹہ زعفرانی.....''

''ارے..... سالے نے تھپڑ مارا اس لڑکی کو.....''

''مگر بھائی..... تم اپنے گال پر ہاتھ کیوں رکھے ہوئے ہو؟؟.....''

''تو نے بھی تو رکھا ہے..... اور تم نے بھی تو رکھا ہے بابا اپنے گال پہ ہاتھ..... ارے..... دیکھو سالے اس کا کپڑا زبردستی اُتار رہے ہیں وہ لوگ..... وہ چلا رہی ہے..... بابا وہ مدد کو چلا رہی ہے.....''

''ہاں بیٹا..... ایسا لگ رہا ہے وہ چلا رہی ہے..... بارش کے شور اور کار کی آواز کے ساتھ ہی اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں..... ارے..... ننگا کر دیا اس کو ان لوگوں نے؟؟!!.....''

''اب بابا..... اب؟''

''کیا کرنے کا بابا؟؟.....''

''دروازہ بند کر دو..... بند کر لو دروازہ..... وہ چار ہیں..... ہم تین ہیں..... ان کے پاس ہتھیار بھی ہو سکتے ہیں.....''

''ہاں بابا..... یہ لو..... بند کر لیا دروازہ.....''

''ارے..... یہ تیرے کپڑے کدھر کھسکے؟..... بابا تمہارے بھی.....''

''تمہارے بدن پر بھی تو کپڑے نہیں ہیں بھائی.....''

''ارے!..... یہ کیا؟؟.....''

''کدھر؟؟.....''

''ہمارے قدموں میں بیٹا.....''

''ارے یہ تو زعفرانی دوپٹہ ہے..... سفید ٹی شرٹ ہے اور گرین پینٹ ہے!..... یہ تو اس لڑکی کے ہیں..... جو باہر تھی..... پھر اپنے کپڑے کیا ہوئے بابا؟.....''

''ہاں اپنے کپڑے؟..... یہ لو..... اندھیرا ہو گیا.....''

''کتنا بھیانک اندھیرا ہے؟؟.....''

''اور بابا..... پانی پھر تیز ہو گیا ہے.....''

''اب کیا کرنے کا بابا.....؟؟''

''ہاں نا بیٹا!!.....''

''.....؟؟''

□□

ابلیس اعظم

غار کے اندر روشن الاؤ کے ناچتے تھرکتے شعلوں کی کم زیادہ ہوتی روشنی اس کی وحشتوں میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ الاؤ سے تھوڑی ہی دور موجود ابلیس ملعون کے وجود سے اس کی تمام ہیبت ناکیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ انسانی کھوپڑیوں سے تیار کردہ بھیانک تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی کمر سے بندھی میان میں تلوار موجود تھی۔ اس کے گلے میں بارگاہِ ایزدی سے عطا کردہ لعنت کا طوق پڑا ہوا تھا۔ طوق کے بوجھ سے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں تڑپتے خنزیر کی ایک ٹانگ تھی۔ اس نے ابھی ابھی اس کا سر کاٹ کھایا تھا۔ خنزیر کی کٹی گردن سے نکلنے والے خون کے دھارے غار کی اوبڑ کھابڑ زمین پر پھیلتے چلے جا رہے تھے اور ابلیس منہ ہی منہ میں کوئی منتر الاپ رہا تھا۔ دائیں طرف اس کا وزیر کھڑا تھا۔

منتر پورا کرنے کے بعد اس نے اپنے سامنے کی ہموار بنائی گئی دیوار پر پھونک ماری۔ دیوار کسی سینما اسکرین کی طرح روشن ہو گئی۔

اس پر کچھ ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی حرکت کرتی دکھائی دیں۔ پرچھائیوں کے رنگ گہرے سیاہ ہوتے گئے۔ غار میں ایک مدہم بھنبھناہٹ سی گونجنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرچھائیاں انسانی شکل اختیار کر گئی۔

انسانوں کا ایک جمِ غفیر دیوار پر متحرک نظر آیا۔

ڈھول، تاشوں بینڈ باجوں کی آوازوں کے ساتھ ہی "جے بھوانی جے شیواجی" "ہر ہر مہادیو"، "رام راج زندہ باد" کے نعروں کی آوازیں غار میں پھیلنے لگیں۔

ابلیس مسکرایا۔ اس نے دیکھا ہزاروں انسانوں پر مشتمل وہ جلوس ترشول، بھالے، تلواریں اور بھگوا جھنڈے لہرا لہرا کر نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جلوس کے آگے ایک رتھ تھا۔ رتھ پر سانپ کی شکل کا

ایک تخت تھا۔ تخت پر سانپ کے پھن کے سائے میں ایک سفید پوش شخص بیٹھا تھا۔ اس نے شانوں پر ایک بھگوا چادر ڈال رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک تھی۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال یکساں لمبائی کے تراشے ہوئے تھے۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ فتح کی خوشی میں سرشار راستے کے اطراف کھڑے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر اشارے کرتا جا رہا تھا۔

رتھ کے آگے آگے بینڈ باجے بجانے والوں کا گروپ پورے جوش و خروش کے ساتھ ڈھول تاشے پیٹ رہا تھا اور ان لوگوں سے بھی آگے ایک کالے لباس والا شخص وحشیوں کی طرح اچھل اچھل کر بے تکان ناچے چلا جا رہا تھا۔ س

ابلیس ملعون نے اس کالے لباس والے شخص کو دیکھا اور اپنے دائیں طرف کھڑے وزیر سے پوچھا۔

''یہ کالے لباس والا کون ہے؟.....''

''یہ..... یہ آپ کی ہی سلطنت کا ایک خادم ہے۔''

''مگر یہ وہاں کیوں ناچ رہا ہے.....؟ بلاؤ اسے۔''

''جو حکم اے عزازیل اعظم!.....''

وزیر نے سر جھکا کر کہا اور سیدھے کھڑے ہو کر کوئی منتر پڑھ کر کالے لباس والے شخص کی طرف پھونک ماردی۔ کالے لباس والا دیوار پر ساکت ہو گیا۔

وزیر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''یہاں آؤ.....''

وزیر کا جملہ پورا ہوتے ہی کالے لباس والا وہ ساکت شخص دیوار سے اُکھڑ کر آگے بڑھا اور سر جھکا کر پوچھا۔

''کیا حکم ہے سرکار؟..... آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا؟.....''

وزیر نے ابلیس کی طرف دیکھا۔

ابلیس بولا۔

''تو انسانوں کے اس جلوس میں کیوں ناچ رہا تھا؟..... کیا تجھے معلوم نہیں انسان ہمارا کتنا بڑا دشمن ہے؟.....''

''وہ.....'' کالے لباس والا مسکرایا اور اپنی بات آگے بڑھائی۔

''وہ میرے بہکائے ہوئے لوگ ہیں..... جو رتھ پر بیٹھا ہے نا عزازیل اعظم..... وہ اپنے علاقے کا ایک سربراہ ہے..... میں نے اسے بہکایا..... اس نے اپنے چیلوں چانٹوں کو ورغلایا..... اور پھر موقع پاکر ایک ٹرین حادثے کی آڑ لے کر انہوں نے پورے علاقے میں فساد پھیلا ڈالا..... دوکانیں لوٹیں..... مکان جلائے..... عصمتیں پامال کیں..... انسانوں کو زندہ جلایا..... ننھے ننھے معصوم بچوں کو نیزوں بھالوں اور ترشولوں پر اُچھالا..... ماؤں کے شکم چیر کر ان میں پرورش پانے والی معصوم جانوں کو آگ میں جھونکا..... اور ان.....''

''مگر یہ جلوس کیسا ہے؟.....''

ابلیس نے درمیان میں پوچھا تو کالے لباس والے نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''یہ جو جلوس ہے نا.....'' اُس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر ہزاروں افراد پر مشتمل جلوس نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی

''..... یہ جلوس گورویاترا ہے..... فخریہ ریلی''

''گورویاترا؟..... فخریہ ریلی؟؟..... کس بات پر فخر؟؟؟.....''

ابلیس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

کالے لباس والے نے سینہ تان کر جواب دیا۔

''فساد..... دنگے..... لوٹ مار..... قتل..... غارت گری اور بلاتکار پر فخر.....''

''نہیں.....''

ابلیس نے اپنی پوری شیطانی قوت سے چلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور میان سے تلوار نکال کر کالے لباس والے کی گردن اڑا ڈالی۔

گردن کٹنے کے بعد اس کا سر ابلیس کے قدموں میں آ گرا اور دھڑ غار کی اوبڑ کھابڑ زمین پر لڑھک گیا۔ اس کی گردن سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے اور اس کا بے سر وجود تڑپنے لگا۔

ابلیس نے اپنی انگارہ آنکھوں سے وزیر کو دیکھا۔ اپنے قدموں میں پڑے کالے لباس والے کے سر کو دیکھا اور ٹھوکر مار کر اُسے الاؤ میں اُچھال دیا۔

ایک سنسناہٹ سی ابھری..... الاؤ کی روشنی تھوڑی کم ہوئی اور ابلیس نے وزیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''فخر..... اور وہ بھی بدی پر..... کبھی نہیں..... میں مانتا ہوں میرا وجود بدی پھیلانے کیلئے ہے.....

میں مانتا ہوں کہ میں بدی کا پیغامبر ہوں..... مگر برائی کو فخر کے قابل نہیں سمجھتا..... بلکہ خود میں نے بھی آج تک اپنی بدی پر کبھی فخر نہیں کیا ہے..... معلوم ہے کیوں؟..... کیونکہ شاید خدا کو میری یہی ادا پسند آ جائے..... اور وہ مجھے معاف کر دے..... مگر یہ انسان.....''

اس نے دیوار کی طرف دیکھا..... ہزاروں انسانوں کا جم غفیر نعرے لگاتے ہوئے رتھ کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا..... ابلیس نے دانت پیستے ہوئے دونوں ہاتھ تخت کے ہتھے پر مارے اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

کالے لباس والے کی تڑپتی ہوئی لاش کو پھلانگ کر دیوار کے قریب گیا۔ لعنت کے طوق کے بوجھ سے جھکی گردن اپنی پوری قوت لگا کر اُٹھائی اور رتھ پر بھگوا چادر لپیٹ کر بیٹھے سنہری فریم کی والے شخص کے منہ پر نفرت اور حقارت سے تھوک دیا۔

اس شخص نے چہرے پر چھینٹے سے محسوس کر کے اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا..... مگر کچھ نہ پا کر پھر سے راستے کے اطراف کھڑے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر فخر کے ساتھ اشارے کرنے لگا۔ □□

خوف

میرا جہاز رن وے پر دوڑ رہا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں۔

بیچارے ایڑو کاکا..... ان کا جسم سڑ رہا ہے..... عجیب تھے ایڑو کاکا بھی..... بالکل عجیب انسان تھے وہ..... چھوٹے بڑے ہندو مسلم سبھی انہیں ایڑو کاکا کہتے تھے..... خدا جانے ان کا نام کیا تھا؟ صرف مجھے ہی کیا..... کسی کو بھی تو ان کا اصل نام نہیں معلوم..... وہ بتاتے بھی کہاں تھے اپنا نام..... البتہ لوگوں کی طرح میں بھی ان کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہندو تھے..... مگر ایک عجیب بات یہ بھی تھی ان کے اندر کہ وہ ہندو ہوتے ہوئے بھی رمضان کے پورے روزے رکھا کرتے تھے..... قرآن کی بہت سی سورتیں بھی تو انہیں یاد تھیں..... جنہیں وہ بڑے اچھے انداز میں پڑھا بھی کرتے تھے..... ان کے منہ سے قرآنی آیات سن کر کبھی کبھی مجھے خود پر شرم بھی آتی تھی..... اور میں سوچا کرتا تھا کہ ایک میں بھی ہوں..... عبداللہ نام ہے میرا..... مسلمان ہوں میں..... قرآنی آیات اور قرآن سے میرا کیا تعلق ہے؟..... کیا واسطہ ہے؟..... صرف اتنا کہ میں اس کا احترام کرتا ہوں..... اسے مخملی جزدان میں لپیٹ کر طاق پر سجائے رکھتا ہوں..... اس کے پاس صبح شام خوشبودار اگربتیاں سلگاتا ہوں..... اور بس..... مگر ایڑو کاکا..... واقعی عجیب انسان تھے وہ..... جتنا وہ بھجن گاتے اُتنا ہی قرآنی آیات کا وِرد بھی کرتے تھے..... اور ایسا کرنے سے انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا..... وہ سوکھی ندی میں ایک کنارے اپنی چھوٹی سی جھگی میں اکیلے ہی رہتے تھے..... ان کے نام ہی کی طرح ان کے رشتے داروں کے متعلق بھی کوئی کچھ نہیں جانتا تھا..... اور وہ خود بھی نہیں بتاتے تھے..... کوئی پوچھتا تو اُسے ہی اپنا رشتہ دار کہہ دیتے..... اور جواز بھی اتنا بھاری پیش کرتے کہ پوچھنے والے کو ان کی رشتہ داری سے انکار کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی..... ایک مرتبہ خود میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا تھا۔

''تم انسان ..... میں انسان ..... تم میرے رشتے دار اور میں تمہارا رشتے دار ..... انسان ایک دوسرے کا رشتے دار نہیں تو پھر کیا ہوا؟ ..... ہاں جو انسان نہیں ..... وہ میرا رشتے دار نہیں ..... تم میرے رشتے دار ..... میں جو اس سوکھی ندی میں رہتا ہوں ..... اس ندی کے اُس پار والے میرے رشتے دار اور اس پار والے میرے رشتے دار ..... ہندو میرے رشتے دار ..... مسلم میرے رشتے دار ..... سکھ عیسائی رشتے دار ..... تم انسان ہو ..... اسلئے تم بھی میرے رشتے دار ..... کیونکہ میں بھی انسان ہی تو ہوں .....''

واقعی ایڈوکا کا انسان ہی تھے ..... ہندو تھے مگر صرف نام کے ..... میں بھی تو مسلمان صرف نام کا ہوں ..... لوگ مجھے عبداللہ بھائی کہتے ہیں ..... کہنا ہی چاہئے ..... ان کے کام جو آتا ہوں ..... انسانوں کے کام آتا ہوں ..... ان کی مدد کرتا ہوں ..... ان کی خدمت کرتا ہوں ..... تب ہی تو میرے سوشل ورک کو دیکھ کر ..... میری خدمات کو دیکھ کر ..... میری سماجی خدمات کے اعتراف میں مجھے پدم بھوشن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے ..... انسانوں سے رشتے داری رکھنے اور سمجھنے کے بدلے میں اتنا بڑا انعام مجھے ملنے والا ہے .....

''خواتین وحضرات! اپنے اپنے سیفٹی بیلٹ کس لیں ..... جہاز رن وے چھوڑنے والا ہے .....''

اعلان سن کر میں نے اپنی حفاظتی پٹیاں کس لی ہیں۔

میرا جہاز رن وے چھوڑ کر فضا میں بلند ہو رہا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں۔

بیچارے ایڈوکا کا! ..... ان کا جسم سڑ رہا ہے ..... ان کے بدن میں کیڑے بج بجا رہے ہیں ..... اور میں پدم بھوشن ایوارڈ لینے جا رہا ہوں ..... پدم بھوشن ایوارڈ لینے جانا ہی ہے ..... اسے پانے کیلئے ہی تو میں نے اتنے سارے سوشل ورک کئے ہیں ..... یہ پرائز ہی میرا خواب تھا ..... اور اب کہیں جا کر اس خواب کی تعبیر مجھے ملنے والی ہے .....

میں جہاز پر بیٹھا ہوں .....

میرا جہاز فضا میں پرواز کر رہا ہے .....

میرے ذہن میں ایڈوکا کا کی معصوم سی صورت اجاگر ہے ..... ان کے گوشت کی سڑاند میرے ذہن میں پھیل رہی ہے ..... مجھے یاد آ رہا ہے ..... ۲۶ اکتوبر کا وہ منحوس دن ..... حالانکہ وہ جمعہ کا دن مسلمانوں کا مقدس دن تھا ..... اور اسی دن ہندوؤں کا تہوار دسہرا بھی تھا ..... مگر فساد بھی اسی روز پھوٹنا تھا ایک پمفلٹ

کے نام پر ..... بس بھاگو بھاگو کی آواز اُبھری تھی ..... لوگ بے تحاشہ بھاگنے لگے تھے ..... اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر اس بھاگ دوڑ کی لپیٹ میں آ گیا تھا ..... لوگ بھاگ رہے تھے ..... دوکانیں لوٹ رہے تھے ..... آگ لگا رہے تھے ..... قتل کر رہے تھے ..... بھاگے جا رہے تھے ..... اور جب یہ بھاگ دوڑ ختم ہوئی ..... لوٹ مار تھمی ..... قتل و غارت گری رکی تو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے پتہ چلا کہ لاکھوں روپے کے سامان لوٹ لئے گئے ..... کروڑوں کی املاک تباہ کر دی گئی ..... درجن بھر ہندوؤں اور درجنوں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا ..... پچاسوں ہندو مسلمان زخمی کر دیئے گئے ..... مگر ..... ایڈوکا کا کو کسی نے زخمی نہیں کیا تھا ..... نہ ہی کسی نے ان کا قتل کیا تھا ..... بس ان کی موت آ گئی تھی ..... وہ اپنی جھگی میں ہی مر گئے تھے ..... حالانکہ فساد تھم چکا تھا ..... آگ بجھ چکی تھی ..... مگر ہندو مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کچھ اتنی زیادہ بڑھ چکی تھی کہ ہندوؤں نے ایڈوکا کا کا انتم سنسکار کرنے سے انکار کر دیا ..... ان کا کہنا تھا کہ وہ روزے رکھتے تھے ..... قرآنی آیات پڑھتے تھے ..... اس لئے وہ ان کا انتم سنسکار نہیں کریں گے ..... اور مسلمانوں نے ان کی آخری رسوم ادا نہیں کی تھیں ..... ان کا کہنا تھا کہ ایڈوکا کا ہندو تھے بھجن بھی تو گاتے تھے ..... اس لئے وہ انہیں اپنے قبرستان میں جگہ نہیں دے سکتے ..... اس دوطرفہ انکار کے درمیان ایڈوکا کا کی لاش پڑی سڑتی رہی ..... اس سے سڑاند اٹھنے لگی ..... اور اسی دوران مجھے اپنا شہر چھوڑنا پڑا ..... کیونکہ میری خدمت خلق کے اعتراف میں مجھے پدم بھوشن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تھا .....

''خواتین و حضرات! اپنی اپنی حفاظتی پٹیاں کس لیں ..... جہاز ابھی ابھی لینڈ کرنے والا ہے۔''

اعلان سن کر میں نے اپنی حفاظتی پٹیاں کس لی ہیں .....

جہاز لینڈ کر رہا ہے .....

میں سوچ رہا ہوں .....

ایڈوکا کا ..... انسانیت کے ناطے میرے رشتے دار ہیں ..... ان کی لاش سڑ رہی ہے ..... ان کے بدن میں کیڑے بج بجا رہے ہیں ..... ان کی لاش سے سڑاند اٹھ رہی ہے .....

میں پدم بھوشن لینے جا رہا ہوں ..... جہاز رن وے پر دوڑ رہا ہے ..... جہاز کی رفتار کم ہو رہی ہے ..... جہاز رُک گیا ہے ..... اور ..... مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے پورے جہاز میں ایڈوکا کا کی لاش کی سڑاند پھیل چکی ہے ..... میں اپنی سیٹ پر دُبکا بیٹھا ہوں ..... مجھے خوف ہے ..... کہ کہیں میں ..... باہر نکلوں تو ..... یہ سڑاند باہر کی فضا میں بھی نہ پھیل جائے۔

□□

پاگو

پاگو نہ جوان دکھائی پڑتا تھا اور نہ ہی ادھیڑ مگر جب بھی دکھائی دیتا ''پاگو... پاگو'' رٹتا رہتا... کبھی چیخ کر، کبھی چلا کر، کبھی بلند آواز میں، کبھی آہستگی سے... کبھی سرگوشی کے انداز میں اور کبھی صرف منہ ہلا ہلا کر ''پاگو... پاگو'' کی گردان کرتا رہتا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ باہر کے لوگ بھی اسے پاگو ہی کہا کرتے تھے۔ حالانکہ اس کا نام غلام مصطفےٰ رکھا گیا تھا۔ مجھے محلے کے بزرگوں سے معلوم ہوا تھا کہ پاگو نے بولنے کی ابتدا ''پاگو'' سے ہی کی تھی... اور پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کی گردان بڑھتی گئی اور گھر والوں کے ساتھ ساتھ باہر کے لوگوں کو بھی علم ہو گیا کہ وہ پاگل ہے۔ حالانکہ وہ پہلی نظر میں پاگل معلوم نہیں پڑتا تھا... سفید کرتا، سفید پاجامہ اور سفید ہی ٹوپی اس کے گورے بدن کا ایک جزو دکھائی دیتی تھی۔ اس کی گھنی داڑھی اور چہرے پر ہمیشہ موجود رہنے والی ایک عجیب سی چمک دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پاگل ہے۔

حالانکہ وہ پاگل ہی تھا... مگر جب بھی اذان کی آواز اسے سنائی دیتی اس کے قدم مسجد کی طرف اُٹھ جاتے۔ وہ ''پاگو، پاگو'' رٹتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتا مگر جیسے ہی مسجد میں داخل ہوتا اس کی آواز بند ہو جاتی۔ ہونٹ بدستور ''پاگو'' کی بے تکان تکرار کرتے رہتے۔ جنہیں نماز کے دوران بھی ہلتے دیکھ کر اس کے بازو سے کھڑے ہونے والے جان پہچان کے نمازی مسکرا کر اپنی نماز میں جٹ جاتے۔

پاگو اپنی نماز ''پاگو، پاگو'' کی ذرا سی تیز آواز سے ختم کرتا اور مسجد سے نکل کر سیدھا نیم کے گھنے درخت کے نیچے بنے چبوترے پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتا۔ اس کی پشت ذرا سی دوری پر موجود اپنے گھر کی طرف ہوتی۔ وہ سردی، گرمی اور برسات، تینوں ہی موسموں میں ہر نماز کے بعد اس چبوترے پر ضرور بیٹھتا۔

فجر بعد وہ چبوترے پر بیٹھا۔ پاگو، پاگو رٹتا رہتا۔ آنکھوں کی پتلیاں گھما گھما کر اطراف کا جائزہ لیتا

رہتا اور سڑک کے اس پار موجود الیکٹرک پول پر روشن بلب کو دیکھ کر آسمان کے مشرقی کناروں کو تکتا رہتا..... جب اس کے پاگو پاگو کی گردان کا ساتھ دینے کیلئے چڑیاں چہچہانا شروع کرتیں تو اس کی گردان کی آواز بڑھ جاتی..... اور جب سورج مشرقی کناروں سے سر اُٹھا کر پاگو کو دیکھتا۔ اس کی نظر سورج پر پڑتی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور سیدھا اپنے گھر کی طرف چل دیتا۔ پاگو پاگو کی گردان اس کے قدموں کا ساتھ دیتی۔

اندر جا کر ناشتہ وغیرہ کر کے اپنے گھر کی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر اپنی گردان میں مست ہو جاتا..... لوگ اپنے کام دھندے میں مشغول ہو جاتے..... لوگوں کی آمد و رفت جاری ہو جاتی..... اور وہ کھڑکی کی سلاخیں تھامے پاگو پاگو کی گردان جاری رکھتا..... اور اس کی یہ گردان ظہر کی اذان کے بعد مسجد میں داخل ہونے پر ہی ٹوٹتی۔ جہاں اس کے ہونٹ بدستور ہلتے رہتے اور بازو سے نماز کیلئے کھڑے ہونے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دیتے۔

ظہر کی نماز ادا کر کے پاگو مسجد سے باہر نکل کر نیم کے نیچے بنے چبوترے کی طرف چل پڑتا۔ اسے وہاں پہلے سے ہی اکا دُکا افراد بیٹھے ملتے۔ ان میں کچھ تو یوں ہی بیٹھتے اور کچھ پاگو کے ہی منتظر رہتے۔ پاگو کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور جب وہ اپنی گردان کے ساتھ ان تک پہنچ کر چبوترے پر بیٹھ جاتا تو ان میں سے کوئی فوراً کہہ اُٹھتا۔

''ابے یار پاگو!..... دیکھ میرا ہاتھ نا درد کرتا ہے یار..... لگتا ہے کسی نے کچھ کر دیا ہے..... اور مجھے تو سلیم پر شک ہے سلیم پر.....''

اتنا سنتے ہی پاگو کی گردان رُک جاتی۔ وہ ماتھا سکیڑتا..... ناک بھوں چڑھاتا اور کہتا۔

''ایسا کیا..... ایسی بات ہے..... رُک ذرا..... اب جب میں مسجد جاؤں گا نا..... تھوڑا زیادہ پڑھوں گا..... پٹی بچھ جائے گی سلیم کی..... جا تو..... پاگو پاگو''

وہ پھر پاگو پاگو رٹتا ہوا ایک ادائے بے نیازی سے لوگوں کو دیکھ کر اطراف کا جائزہ لینے لگتا..... اور لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر پھُسپھُسا کر ہنسنے لگتے۔

کوئی کہتا۔

''اے پاگو..... دیکھنا یار..... میرا سر بہت دُکھتا ہے..... دس پندرہ دن ہو گئے..... کہیں کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا؟.....''

''پاگو'' کی گردان ٹوٹ جاتی۔

''کون ہے؟...... وہی جاوید ہو گا...... رُک ذرا...... اب جب میں مسجد جاؤں گا نا...... تھوڑا زیادہ پڑھوں گا...... بتی بجھ جائے گی جاوید کی...... دیکھ لینا...... بتی بجھادوں گا...... جا تو...... پاگو پاگو''

وہ اتنا کہتا پھر اپنی گردان میں جٹ جاتا اور لوگ پھسپھسا کر ہنسی دبانے لگتے۔

''اے یار پاگو...... تیرے پر بھی تا کسی نے کچھ کر دیا ہے...... لگتا ہے اکرم ہے...... اکرم''

پاگو کی گردان ٹوٹ جاتی اور وہ کچھ سوچنے کے سے انداز میں آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگتا۔

''وہی سے تو...... میرا پیر دُکھتا ہے...... یہ اکرم کہاں ہے؟...... بتا تو کہاں ہے اکرم؟''

''وہ تاں...... وہ مُلا ہوٹل پر بیٹھا ہے......''

''ایسا...... رُک ذرا...... دیکھ جا کر تو...... میں تاں...... ابھی جا کر مسجد میں تھوڑا پڑھتا ہوں...... تو جا کر دیکھ۔ اس کے پیچھے کی جو دیوار ہے نا...... وہی گراتا ہوں اس پر...... بتی بجھاتا ہوں جا کر...... دیکھ جا کر تو...... پاگو پاگو......''

وہ پاگو پاگو، رٹتا ہوا اُٹھتا اور مسجد کی طرف چل پڑتا...... تھوڑی دیر بعد چبوترے پر واپس آ کر بیٹھ جاتا۔

ابھی کل ہی تو میں نے مغرب کے بعد اسے چبوترے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ کچھ لوگ اور بھی تھے...... وہی اس سے مزہ لے کر باتیں کر رہے تھے...... میں بھی چبوترے کی طرف چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی پاگو نے بول اُٹھا......

''ارے شکیل بھیا!...... آؤ نا...... بیٹھو......''

میں جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

''اے پاگو...... یار مجھے نوکری نہیں مل رہی ہے......''

''ایسا...... رکو ذرا...... میں تاں ابھی عشاء میں جا کر تھوڑا سا زیادہ پڑھوں گا اور کل...... کل صبح تمہیں نوکری مل جائے گی...... دیکھ لینا تم...... پاگو پاگو''

پاگو کی گردان سن کر میں اپنے گھر چل دیا۔ میرا گھر پاگو کے بازو سے ہی تھا۔ دوسرے روز تقریباً گیارہ بارہ بجنے کے قریب میرا ایک دوست عارف ایک خوشخبری لیکر آیا...... میری نوکری کی خوشخبری لے کر...... اس نے اُدھر ہی اُدھر میری نوکری پکی کر لی تھی...... اپنے باس سے بات کر کے...... کیونکہ اس کے باس کو ایک ایماندار اور محنتی اکاؤنٹنٹ کی فوری ضرورت تھی۔

میں تیاری کر کے آفس روانہ ہو گیا۔ جب شام ڈھلے آفس سے فرصت ملی تو میں نے پاگو کیلئے ایک باکس میں مٹھائی خریدی۔ باس نے آج ہی خرچ کیلئے سو روپے دیئے تھے۔ میں مٹھائی کا وہ باکس لے کر آشیانوں کو لوٹتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف آیا تو میرے ماتھے پر شکن پڑ گئی کیونکہ چبوترے کے پاس پٹیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ سر پر رومال باندھے، ٹوپی پہنے افسردہ سے ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے..... میں نے ایک بزرگ کے قریب جا کر ان سے پوچھا۔

''چاچا!..... یہ پٹی کیوں بچھی ہے..... کسی کا انتقال ہو گیا ہے کیا؟.....''

''ہاں بیٹا!..... پاگو کا۔''

میرا دل دھک سے ہو گیا۔

''مگر کیسے؟..... کب؟.....'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں بیٹا!..... پاگو عصر بعد چبوترے پر اکیلا بیٹھا تھا..... اُدھر سے پولس جیپ آئی..... جیپ کی آواز سن کر پاگو چبوترے سے کود کر بے تحاشہ چیختا چلاتا اپنے گھر کی طرف بھاگا..... مگر وہ دو چار قدم دوڑا ہی تھا کہ جیپ سے گولی چلی..... اور پاگو کی کھوپڑی میں جا لگی..... حرامی لوگوں نے دہشت گرد بول کر انکاؤنٹر کر دیا..... پاگو کا انکاؤنٹر..... اور اس کی لاش بھی نہیں دی کتوں نے ابھی تک.....''

ان کی آواز مزید رو ہانسی ہو گئی..... آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے..... میں نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں میں تھمے مٹھائی کے باکس کو دیکھا..... باکس دھندلا گیا..... اور..... میرے آنسو باکس پر آ گرے۔

□□

چراغ

''بیٹا! تونے اپنے کمرے میں چراغ نہیں جلایا'' ماں نے کہا۔

''اوں..... کیا امّی؟'' نوجوان بیٹا چونکا۔

''میں بولی..... تونے اپنے کمرے میں خوشی کا چراغ نہیں جلایا..... کیا تجھے معلوم نہیں کہ دشمن ملک سے آج ہمارا ملک جنگ جیت گیا ہے..... ہزاروں دشمن فوجیوں کو ہمارے فوجیوں نے موت کی نیند سلادی ہے..... آج تو اپنی خوشی کا دن ہے نا..... فتح کا دن ہے نا..... آج تو جشن منانا ہے ہمیں..... اپنی خوشی کا اظہار کرنا ہے..... مگر تو ہے کہ سرِ شام اپنے کمرے میں اندھیرا کئے بیٹھا ہے..... چل اُٹھ..... چراغ جلا جلدی سے.....''

''نہیں امّی!..... میں چراغ نہیں جلاؤں گا.....''

اُسے اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''کیوں بیٹا؟..... چراغ کیوں نہیں جلائے گا؟..... کیا یہ غدّاری نہیں ہوگی وطن سے؟.....''

''میرے خیال سے نہیں.....'' بیٹے نے پورے اعتماد سے کہا اور اپنی بات جاری رکھی.....

''اور..... امّی اگر غدّاری ہوئی بھی تو یہ غدّاری مجھے قبول ہے..... مانا کہ آج ہمارا ملک جیتا ہے..... مانا کہ آج ہماری فتح ہوئی ہے..... مگر کیا ہمارا ایک بھی فوجی جوان شہید نہیں ہوا؟..... کیا ہماری ایک بھی بہن بیوہ نہیں ہوئی؟..... کیا ہمارے ملک کا ایک بھی بچہ یتیم نہیں ہوا؟..... اور جن لوگوں کو ہمارے فوجیوں نے مار ڈالا ہے امّی..... کیا وہ انسان نہیں تھے؟..... یا سچ مچ کوئی مٹی گارے کے پتلے تھے؟..... بولو نا امّی..... انسان ہی تو تھے نا وہ لوگ بھی..... وہاں بھی کوئی بہن بیوہ ہوئی ہوگی..... کوئی بچہ یتیم ہوا ہوگا..... کوئی ماں بے سہارا ہوئی ہوگی نا..... بولو نا..... جواب دو نا امّی.....''

ماں سے جواب مانگتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا.....

''ہاں بیٹا!..... انسان ہی تھے وہ..... مگر وطن؟.....''

'' کچھ نہیں امّی..... کیا ہزاروں انسانوں کی موت پر..... ہزاروں بہنوں کے بیوہ ہونے پر..... ہزاروں بچوں کے یتیم ہونے پر اور ہزاروں ماؤں کے بے سہارا ہونے پر خوشی کے چراغ جلانا ایک انسان کو زیب دیتا ہے؟..... کیا خود انسانوں کی ہی موت پر انسانوں کا جشن فتح منانا بھلا معلوم پڑتا ہے؟..... نہیں امّی..... یہ جانوروں کا کام ہے..... بلکہ جانور بھی ایسا نہیں کرتے..... وہ بھی تو دوسرے جانوروں کی موت پر افسردہ ہو جاتے ہیں..... مگر ہم بڑے کم ظرف ہیں..... اپنی جھوٹی انا کیلئے..... اپنی برتری کیلئے..... اپنے مفاد کیلئے دوسروں سے جنگ کرتے ہیں..... اور..... اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر اپنی ذلالت کا ثبوت دیتے ہیں..... جشن مناتے ہیں..... میں چراغ نہیں جلاؤں گا.....''

بیٹے کی باتیں سن کر ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور اس کے کمرے سے نکل گئی..... بیٹا اسے باہر جاتے دیکھتا رہا..... وہ اس کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی..... چلتے چلتے چھوٹے سے طاق کے پاس جا پہنچی..... طاق میں ایک چراغ روشن تھا..... اس کی لو ہوا کے جھونکوں پر تھرک رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے کے کمرے کا دروازہ دیکھا..... سر گھما کر اپنے جلائے ہوئے چراغ کو دیکھا اور پھونک مار کر اسے بجھا دیا..... اس کی آنکھوں کے کناروں پر ستارے جھلملانے لگے.....

□□

ابھی انسان زندہ ہے

میں کالو بھنگی کے جھاڑو کی سرسراہٹ سے تنگ آ گیا ہوں۔ دس برسوں سے اس کے جھاڑو کی یہ سرسراہٹ برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں مگر اب اس سے اس کے جھاڑو سے اور اس کی سرسراہٹ سے میں جھنجلا سا گیا ہوں۔ اس کا جھاڑو بردار وجود میرے ذہن کو بوجھ لگ رہا ہے۔ حالانکہ میرے اپنے ذہن کی دنیا میں میرے افسانوں کے ان گنت کردار موجود ہیں...... باپو کاکا ہیں۔ وہ اپنی گاندھیائی مسکراہٹ کے ساتھ ''اہنسا پارک'' کی بدستور رکھوالی کر رہے ہیں...... پٹھانے ہے...... اپنی ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھا لوگوں کے آرڈر سن کر اپنے نوکروں کو ان کے احکام کی تکمیل کے لئے حکم دے رہا ہے...... دین محمد لائن آف کنٹرول کے آس پاس اپنی بکریاں چرا رہا ہے...... انور حمال اپنی ساری تھکن ساتھ لئے اپنے ٹھیلے کو کھینچے جا رہا ہے...... انسان کی تلاش میں بھٹکتی...... وادی وادی...... جنگل جنگل...... صحرا صحرا ماری ماری پھرتی انسانیت ہے...... ایڑو دادا ہیں جو روزانہ صبح ہی صبح بھجن کے ساتھ ساتھ قرآن کی آیتوں کی بڑی دلنشیں تلاوت کرتے ہیں...... خورشید ہے جو اپنی بلیک اینڈ وہائٹ نظروں سے دنیا کی رنگینی کو دیکھ رہا ہے...... کرنل شاہد خان ہے جو اپنے خاندان پر مظالم کے انتقام میں سزا کاٹ رہا ہے...... نظیرہ ہے جو اپنے بیان بدلنے پر مجبور ہے...... پاگو ہے...... جو اپنی پاگو...... پاگو کی رٹ لگائے ہوئے ہے...... غرض کہ میرے افسانوں کے ہزاروں کردار میرے اپنے ذہن کی چھوٹی سی دنیا میں سانس لے رہے ہیں...... اور یہ آبادی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے...... میں نئے کردار تخلیق کرتا جا رہا ہوں...... میرے ذہن کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے...... اور میں مطمئن ہوں کیونکہ یہ سارے لوگ میرے اپنے ہیں...... ان کے اردگرد بنائی گئی فضا میری اپنی ہے...... مگر یہ کالو بھنگی؟؟...... یہ ناہنجار تو کرشن کا کردار ہے...... یہ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں گھس آیا ہے؟...... اور گذشتہ دس برسوں سے مجھے پریشان کئے چلا جا رہا ہے......

میں اپنے ذہن کی دنیا کے لئے جو بھی کردار تخلیق کرتا ہوں ..... یہ اپنا جھاڑو لئے اس کا پرتپاک استقبال ضرور کرتا ہے ..... یہ کرشن چندر کی طرح مجھے افسانے لکھنے کا چیلنج نہیں کرتا کہ میں بھی اس پر افسانہ لکھوں ..... شاید کرشن سے افسانہ لکھوانے کے بعد یہ جان گیا ہو کہ فنکار کے منہ نہیں لگنا چاہئے ..... مگر یہ تو میرے سر لگ گیا ہے ..... اور اس کا نجس وجود دس برسوں سے میں برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں ..... ابھی جبکہ میں ایک افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں ..... ایسا افسانہ جو قاری کے دل کو چھو لے ..... قاری کے ذہن کی دیوار ہلا کر رکھ دے ..... قاری کے دل میں انسانیت کا جذبہ پیدا کر دے ..... یہ نا ہنجار اپنے منحوس جھاڑو سمیت میرے ذہن کی دنیا کے صدر دروازے کے آس پاس جھاڑو لگا رہا ہے ..... سر ..... سر ..... سڑ ..... سڑ ..... سر ..... سر سر .....

اور اس کے جھاڑو کی سرسراہٹ بار بار مجھے تنگ کئے جا رہی ہے۔ ہر سرسراہٹ پر میں ایک جھرجھری سی محسوس کر رہا ہوں ..... میرے بدن کے روئیں اس کے جھاڑو سے تنگ آ کر احتجاج کرنے اٹھ کھڑے ہو رہے ہیں ..... اور میں بہت ہی جھنجھلاہٹ میں اپنا قلم ٹیبل پر پٹخ رہا ہوں ..... میری نظر ٹک ٹک کرتی دیوار گھڑی پر پڑ رہی ہے ..... وہ گیارہ بجانے کو ہے ..... دسمبر کی چھ تاریخ خوفزدہ انداز میں نیچے کی طرف سرکنے کی کوشش کر رہی ہے ..... گھر کے باہر سناٹا ہے ..... میرے اپنے گھر کی ہی طرح سبھوں کے گھر کے دروازے بھی بند ہیں ..... کرفیو لگا ہوا ہے ..... شوٹ ایٹ سائٹ کا آرڈر پولس کو مل گیا ہے۔

کرفیو کے سناٹوں میں کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے کر باہر کی زندگی کا احساس دلا دیتی ہیں ..... جن کے بند ہوتے ہی پھر وہی سناٹا چھا جا رہا ہے ..... مگر ان سناٹوں کے درمیان دور نزدیک سے گزرنے والی اکا دکا پولس جیپ اور کبھی پولس کے جوتوں کی کھٹ کھٹ ابھر کر کرفیو کے احساس میں شدت پیدا کر رہی ہے۔ یہ کرفیو ہندو مسلم فساد کے سبب نافذ کیا گیا ہے ..... فساد بھی تو عجیب انداز سے شروع ہوا ہے ..... ٹرین کی ایک بوگی جلی ..... فسادی اس بوگی میں کارسیوکوں کو موجود بتا کر بوگی جلانے کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کر ان کا جانی و مالی نقصان کر رہے ہیں تو مسلمان بھی بدلے میں ہندوؤں کا نقصان کر رہے ہیں ..... سبھوں کی زندگی اس فساد اور کرفیو نے اجیرن کر رکھی ہے ..... مگر مجھے تو کالو بھنگی کی جھاڑو کی سرسراہٹ پریشان کئے ہوئے ہے ..... تنگ کئے ہوئے ہے اور میں اپنے ٹیبل پر پٹخے گئے قلم کو اٹھا کر اپنے لیٹر پیڈ کو رکھ رہا ہوں اور مارے جھنجھلاہٹ کے اپنے ذہن کی دنیا میں ہی گھس پڑا ہوں۔

کالو بھنگی میرے سامنے ہے ..... وہ جھک کر آہستہ آہستہ جھاڑو مار رہا ہے ..... زمین پر جھاڑو مارتے

مارتے وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے ..... پھر بھی اس کے جھاڑو کی سرسراہٹ جاری ہے اور میری موجودگی سے لاعلم بنا وہ اس سرسراہٹ کے ساتھ آگے ہی بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اس حرکت پر اور بھی جھنجھلا گیا ہوں ..... اور تقریباً پوری قوت سے چیخ پڑا ہوں۔

''ابے اے کالو بھنگی! ..... روک اپنی جھاڑو .....''

کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ ہی میرے ذہن کی پوری دنیا چونک پڑی ہے۔ وہاں کے درخت، فلک بوس عمارتیں، عجیب وغریب جانور، چرند، پرند، زمین، آسمان، بیل بوٹے، جھاڑ جھنکاڑ، طرح طرح کی سواریاں ..... آلات، مشینیں، کشادہ سڑکیں، دریا، ندیاں، تالاب، پھول کلیاں، چاند، ستارے، سب کے سب چونک کر مجھے تک رہے ہیں ..... میرے اپنے فسانوں کے کردار بھی محو حیرت ہیں اور کالو بھنگی بھی حیرت سے مجھے تکے جا رہا ہے ..... اس کی حیرت پر مجھے غصہ آ گیا ہے ..... کتنا معصوم بن رہا ہے وہ؟ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں ..... اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

''پھینک اپنا جھاڑو ایک طرف .....''

''مگر ساب جی .....''

''اگر مگر اور صاحب واحب کچھ نہیں ..... میں نے کہہ دیا نا پھینک دے جھاڑو ..... بس پھینک دے .....''

''اچھا ساب ..... یہ لو ..... پھینک دیا ..... پن ساب! ایہاں سفائی و پھائی کون کری ہمار باد ..... آں؟ .....''

''تو یہ سب مت سوچ ..... میں سوچوں گا ..... تو ادھر آ ..... پورے دس برس سے پریشان کر رکھا ہے تو نے ..... ذرا ادھر آ ..... تیرا تو آج قصہ ہی پاک کر دیتا ہوں .....''

''ساب! ای کتہ پاک کا ہوت ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں ..... ابھی معلوم پڑ جائے گا تجھ کو ..... نیلم پری ..... او نیلم پری ..... کدھر ہو تم ..... جلدی آؤ یہاں .....''

''آ گئی جناب! حکم فرمایئے .....''

''یہ دیکھو ..... یہ کالو بھنگی! ..... دس سالوں سے تنگ کر رکھا ہے مجھے اس کے جھاڑو نے ..... اور یہ ہے کہ اس جھاڑو کو پھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا ..... وہی پرانا جھاڑو ہے جو لے کے اس کی موت ہوئی

وہی بڑے بڑے ننگے گھٹنے ...... پھٹے پھٹے کھردرے اور بدصورت پاؤں ...... سوکھی ٹانگیں ...... جھوکا پیٹ ...... گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے مرجھایا سینہ ...... سکڑے ہونٹ ...... پھیلے نتھنے ...... جھریوں والے گال ...... نیم تاریک گڑھوں میں آنکھیں اور ان کے اوپر چندیا ...... ذرا سا بھی نہیں بدلا ہے یہ مرنے کے بعد بھی ...... اور مرنے کے بعد وہی جھاڑو لئے پھر رہا ہے جیسے اسے اپنی ماں کے پیٹ سے ہی اٹھا کر لایا ہے یہ ...... تم ایسا کرو اس کا حلیہ ٹھیک کرو اور اس کے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر قوس قزح کے اس پار لے جاؤ ...... اور وہاں کسی پری یا اپسرا سے اس کی شادی کرادو ...... تاکہ پھر کبھی یہ منحوس اپنے جھاڑو سے مجھے تنگ نہ کرے ......''

''اچھی بات ہے جناب ...... یہ لیجئے ......''

نیلم پری نے اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ کی چھڑی سے کالو بھنگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا ہے اور کالو بھنگی کی جگہ زرق برق لباس میں ایک خوبرو شہزادہ کھڑا دکھائی دے رہا ہے جس کے ہاتھوں کو نرمی اور چاہت سے تھامے نیلم پری کہہ رہی ہے ......

''کیسی رہے گی ہماری جوڑی ......؟؟''

''بہت خوب ...... بہت خوب ...... لے جاؤ اسے ...... مبارک ہو تمہیں یہ ...... مگر خبردار جو اسے دوبارہ ادھر آنے دیا ...... اچھا نہیں ہوگا ...... اور تو بھی سن لے کالو بھنگی ...... کان کھول کر سن لے ...... اب دوبارہ تو کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا ...... جاؤ ...... ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرو تم دونوں ......''

''شکریہ صاحب!''

''سکریہ ساب!''

دونوں شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ نیلم پری خوش ہے اور کالو بھنگی کے لہجے سے ممنونیت جھلک رہی ہے ...... پھر اچانک ہی دوبارہ روشنی کا جھما کا ہوا ہے ...... وہ دونوں ہی غائب ہو گئے ہیں اور میں ٹھنڈی سانس لے کر اپنے ذہن کی دنیا سے باہر نکل کر ٹیبل کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا سوچ رہا ہوں۔

''چلو اچھا ہوا ...... نجات تو ملی کالو بھنگی کی جھاڑو کی سرسراہٹ سے ...... اچھا ہے ...... نیلم پری اسے قوس قزح کے اس پار لے کر چلی گئی ......''

اتنا سوچتے ہی میری نظر ٹائم پیس کی دیوار گھڑی کی طرف اٹھ گئی ہے ...... وہ سوا گیارہ بجا رہی ہے ...... اور میں اپنے بیڈ پر سے قلم واپس رکھتے اٹھا ہوں

افسانے لکھتا ہی رہا ہوں اور وقت اپنے ساتھ نو دس برس لے کر چلا گیا ہے

میں نو دس برسوں بعد پھر ٹیبل کے قریب رکھی اپنی کرسی پر ہی بیٹھا ہوں ..... میری نظر ٹک ٹک کرتی دیوار گھڑی پر ہے ..... مگر آج رات کی بجائے دن کے گیارہ بجے ہیں ..... دسمبر کی چھ ہی تاریخ ہے باہر سناٹا نہیں ہے ..... گولیاں چلنے کی آوازیں ..... دستی بم پھٹنے کی آوازیں ..... سوڈا واٹر کی بوتلوں کے پھٹنے کی آوازیں ..... نعروں کی آوازیں ..... انسانوں کے چیخنے چلانے اور کراہنے کی آوازیں فضا میں گونجتی ہوئی میرے احساس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی ہیں ..... انسان جلائے جا رہے ہیں ..... انسان کاٹے جا رہے ہیں ..... انسان مر رہے ہیں ..... انسان ہی مار رہے ہیں ..... اور انسانوں کے مرنے مارنے کا سلسلہ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے ......

"کیونکہ آدمی کے اندر کا انسان مر گیا ہے ......"

میں چونک گیا ہوں ......

یہ کس کی آواز گونجی ہے میرے ذہن میں؟؟؟

میں اپنے ذہن کی دنیا میں پھر داخل ہو گیا ہوں ..... میرے سامنے ہی نیلم پری ..... کالو بھنگی اور ایک سات آٹھ سالہ خوبصورت سی بچی ہے ..... تینوں کے ہاتھوں میں جھاڑو ہے ..... بچی مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھ رہی ہے ..... میں اسے غور سے دیکھ رہا ہوں ..... نیلم پری اور کالو بھنگی ..... دونوں کی جھلک بچی میں دکھائی دے رہی ہے ..... وہ پیاری سی معصوم سی بچی مجھ سے کہہ رہی ہے ......

"دیکھیے نا انکل! گندگی کتنی ہو گئی ہے یہاں ..... کتنی لاشیں ہیں یہاں پر ..... بدبو کتنی زیادہ ہے ...... کتنی سڑاند پھیلی ہوئی ہے ......"

میں اپنے ذہن کی تباہ و برباد دنیا پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اس سے باہر نکل گیا ہوں ..... باہر بھی انسان مر رہے ہیں ..... مرتے جا رہے ہیں ..... لاشیں پھیلی ہوئی ہیں ..... حیوانیت کا ننگا ناچ جاری ہے ..... اور میرے ذہن کی دنیا کے اندر تین انسان حیوانوں کی پھیلائی گئی گندگی کو صاف کر رہے ہیں ان کے جھاڑو کی سرسراہٹ اب مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے ..... اتنی اچھی کہ ہر سرسراہٹ کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں اور میں ٹیبل کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ کم از کم میرے اندر ہی سہی مگر انسان ابھی زندہ تو ہے۔

□□

روشنی کی تلاش

اُس کشادہ سی پگڈنڈی پر بہت سے لوگ ایک مخصوص انداز سے اپنے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ پگڈنڈی ہری گھانسوں کے درمیان سے گذرتی چلی جا رہی تھی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے ان لوگوں کی آمد کی خوشی میں گھانسوں کو گدگداتے ہوئے گذر رہے تھے۔ نازک گھانسوں کے جھومتے لہراتے بدن دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہرے رنگ کے دریا نے ان منظم لوگوں کیلئے اپنا سینہ چیر کر راستہ بنا دیا ہو اور سورج کی زرد کرنیں ہرے پانی کی موجوں پر اٹھکھیلیاں کر کے ان کا استقبال کر رہی ہوں۔

وہ سارے منظم لوگ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی پیشانیاں چمک رہی تھیں۔ ان کے پرسکون چہروں سے ایک عجیب قسم کی نورانیت ٹپک رہی تھی اور وہ تمام لوگ سفید لبادوں میں ملبوس آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی نظریں پگڈنڈی پر آگے کی طرف پھسلتی جا رہی تھیں۔

سورج نے غروب ہونے کی تیاری میں اپنی کرنوں کو سمیٹنے کی ابتدا کی ہی تھی کہ وہ تمام لوگ رک گئے۔ سورج حیران ہو کر ان کے چہروں کو تکنے لگا۔ ان کے چہروں پر پریشانیوں کی پرچھائیاں اسے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی چمکتی پیشانیوں پر تفکرات کی گہری لکیریں نمودار ہو چکی تھیں اور ان کی پرسکون نظریں بے چین ہو چکی تھیں۔

اس منظم گروہ کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پریشان کھڑا تھا۔ ہر کسی کے ذہن میں سوالات سر ابھار رہے تھے۔

''کدھر جاؤں؟''

''کس طرف جانا مناسب ہے؟''

''میں جس راستے پر جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کیا وہی راستہ صحیح ہے؟''

''کیا دوسرے تمام راستے غلط ہیں؟''

''میں اپنے راستے پر چل کر اس بے مثل و بے مثال نور کا دیدار کر سکوں گا؟''
''جس نور کیلئے میں اس سفر کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں کیا وہ نور اسی راستے سے مل جائیگا مجھے؟''
''کیا دوسروں کو نہیں ملے گا وہ نور؟''

اس قسم کے بہت سے سوالات ان کے ذہنوں میں سانپوں کی طرح پھن پھیلائے کھڑے تھے کیونکہ اس کشادہ سی پگڈنڈی سے چار چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں پھوٹ کر الگ الگ سمتوں میں جا رہی تھیں اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو اس کالی رات کی یاد آ رہی تھی جب چاند طلوع ہی نہیں ہوا تھا۔ تارے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کالے بادلوں سے ڈھکا آسمان تاریک رات کو مزید تاریک کئے جا رہا تھا۔

اس تاریک ماحول میں بہت سے لوگ بتوں کے آگے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ انہیں امید تھی کہ پتھر کی ان سورتوں سے ہی روشنی کی کرن پھوٹ کر تاریک رات کا سینہ چاک کر دے گی مگر پتھر کی وہ مورتیں پتھر ہی بنی تاریک رات کی سیاہی سے نجات کے بارے میں سوچتی رہیں اور وہ لوگ انہیں کے آگے سر جھکائے روشنی کی امید لئے بیٹھے رہے۔

اچانک ہی ایک بڑی پیاری مردانہ آواز ان کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔

''اے لوگو! اگر ہمیشہ رہنے والے نور کا قرب چاہتے ہو تو آؤ میرے ساتھ...... اگر اس نور کا دیدار چاہتے ہو...... تو آؤ میرے پیچھے...... میں تمھیں سیدھا راستہ دکھاتا ہوں...... اس بے مثل و بے مثال اور ہمیشہ رہنے والے نور کا......''

ان لوگوں نے چونک کر آواز دینے والے کی طرف دیکھا تھا تاریک رات میں اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا ان کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ ٹیلے پر سے نیچے اتر رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے جادوگر سمجھ کر اپنی جگہوں پر ہی بیٹھے رہے اور بہت سے لوگوں نے اسے سچا مانا اور اس کے ساتھ چل پڑے۔

اسی نورانی چہرے والے نے انھیں بتایا تھا کہ ویران میدان سے گذرنے کے بعد ایک ریگستان آئے گا...... پھر چٹیل میدان دکھائی دے گا...... میدان کے بعد ایک پہاڑی ملے گی...... پہاڑی سے گذرنے کے بعد بڑی دور تک بے آب و گیاہ زمین پر سفر کرنا ہوگا...... تب راستے میں ایک اونچا ٹیلہ نظر آئے گا...... اس ٹیلے سے اترنے کے بعد ایک کشادہ سی پگڈنڈی ملے گی جس کے دونوں اطراف ہریالی پھیلی ہوگی...... اس کشادہ پگڈنڈی پر چل کر کئی راستے اس سے پھوٹیں گے مگر راستوں کی بھیڑ میں پڑنے کی بجائے کوئی ایک سیدھا اور آسان راستہ اپنا کر سفر کرنے...... اس پر خلوص دل اور ثابت قدمی سے آگے

بڑھنے پر وہ نور خود بخود دکھائی دے گا جو کہ بے مثل و بے مثال ہے..... اس کی کوئی نظیر اس دنیا میں نہیں ہے ..... وہ نور خود ہی اپنا دیدار کرائے گا.....''

مگر وہ لوگ اس وقت تذبذب کا شکار تھے۔ ان کے سامنے چار راستے تھے۔ مسئلہ راستے کا انتخاب کا تھا اور تمام ہی لوگ شش و پنج میں تھے کہ کدھر اپنا قدم بڑھائیں؟

ابھی ان لوگوں کی کش مکش ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ ایک آواز ابھری۔

''ہمیں مغربی راستہ اپنانا چاہئے۔ یہ منزل تک لے جائے گا'' لوگوں نے آواز لگانے والے کی طرف دیکھا۔ بڑا نورانی چہرہ تھا اس کا۔ وہ ان چاروں راستوں میں سے مغرب کی طرف والے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا..... اس نے دس بارہ قدم ہی اٹھائے تھے کہ دوسرے برگزیدہ شخص نے مشرقی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''اس راستے پر چل کر اس نور کو پایا جا سکتا ہے۔'' اس برگزیدہ شخص کے تھوڑی دور تک جاتے ہی تیسری آواز نے انھیں چونکا دیا۔

''دوستو! ہمیں اس راستے پر چلنا چاہئے..... یہی تو سیدھا اور آسان راستہ ہے ہماری منزل کا۔''

لیکن اس آواز کے تھمتے ہی چوتھی آواز ان پریشان لوگوں کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔

''مغربی راستے کے بازو والا راستہ سیدھا اس بے مثال اور ہمیشہ رہنے والے نور کی طرف جاتا ہے..... اس لئے آؤ..... اور اس راستے پر چلو۔''

وہ دونوں آواز لگانے والے بھی اپنے اپنے راستوں پر آگے بڑھ گئے اور اس کشادہ سی پگڈنڈی پر موجود لوگ پریشانی کے عالم میں خاموش بت بنے کھڑے رہے۔ ان کا تذبذب..... پریشانی..... اور خاموشی دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے سبھوں کو سانپ سونگھ گیا ہو.....

اچانک ہی خاموشی سے ایک بھنبھناہٹ نے سر ابھارا..... وہاں ہلچل سی مچ گئی..... اور تھوڑی ہی دیر میں ان چاروں آوازوں کے کچھ لوگ حامی بن گئے تو کچھ مخالف۔

ایک مقصد سے ایک ساتھ چلنے والے وہ سفید لبادے والے لوگ راستوں کی بنیاد پر چار الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو کر صرف اپنے ہی چنندہ راستے کو صحیح مان کر دوسرے گروہوں پر لعن طعن کرنے لگے۔ دوسروں کے راستوں کو غلط ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ اور یہ زور کچھ اتنا بڑھا کہ ایک دوسرے پر غلط روی کا الزام عائد کیا جانے لگا..... دوسروں کی عقل کا ماتم کیا جانے لگا.....

ایک دوسرے پر طنز کے تیر برسائے جانے لگے اور نوبت گالی گلوچ تک جا پہنچی..... اس پگڈنڈی پر موجود افراد کی پیشانیوں پر بل پڑنے لگے ان کے چہروں کا نور غائب ہوگیا..... ان کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ نفرت نے ان کے چہروں پر خاک سی مل دی اور وہ خوفناک بنتے چلے گئے۔

جیسے جیسے ان کے سوچنے کے انداز بدلے ویسے ویسے ان کے سفید لبادوں کی رنگت بھی تبدیل ہوتے گئی۔ ایک گروہ کے سفید لبادے سیاہ بن گئے..... دوسرے کے سرخ ہوگئے..... تیسرا سبز پوش بن گیا تو چوتھا زرد لبادے والا۔ مگر یہ بدلتی فکر..... بدلتی ہیئت اور تبدیل ہوتی رنگت یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اچانک ہی زور کا شور اٹھا اور ان سبھوں کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

جب ان کے ہاتھ نیچے ہوئے تو کسی کے گرفت میں چاقو تھا..... کسی میں خنجر..... کسی میں بھالا..... کسی میں تلوار..... اور کسی نے نیزہ تھام رکھا تھا تو کسی نے بندوق پکڑ رکھی تھی۔

ان لوگوں نے دوسرے گروہ والوں کو گھور گھور کر دیکھا اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

ان لوگوں کی چیخیں..... آہیں..... کراہیں اور نفرت بھری آوازیں پگڈنڈی پر گونجتی رہی..... اور لوگ زخمی ہوتے رہے..... تڑپتے رہے..... گرتے رہے..... مرتے رہے..... زخمی ہونے والوں میں چاروں گروہ کے لوگ شامل تھے آہیں بھرنے والوں میں ہر رنگ کے لبادے والے تھے..... اور مرنے والوں میں سبھی ٹولی کے افراد تھے..... جنھیں دیکھ کر اپنی کرنیں سمیٹ لینے والے سورج نے ایک جھرجھری سی لی اور کانپنے لگا۔ سورج کی بگڑتی حالت دیکھ کر دھندلکوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی جسم کی دیوار کھڑی کردی۔

آدھے سے کچھ کم لوگ بدگمانی کے زہر کا شکار ہو کر اس کشادہ سی پگڈنڈی پر بکھرے پڑے تھے اور زندہ بچ جانے والے لوگ اس زہر کو اپنے دل و دماغ میں بسائے چار الگ الگ راستوں پر چل پڑے۔ چاروں ہی راستوں پر جیسے جیسے ان کے قدم آگے بڑھتے گئے۔ راستوں کے دونوں طرف دیوار اٹھتی گئی اور ان کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی دیواریں بھی بڑھتی گئیں اور ہر راستے پر چلنے والا گروہ دوسرے راستے پر جانے والے گروہوں کو غلط سمجھتا رہا..... انھیں برا بھلا بولتا رہا..... ان سے نفرت کرتا رہا اور صرف اپنے راستے کو ہی صحیح سمجھتا رہا۔

اچانک ہی اس پگڈنڈی سے پھوٹنے والے چاروں ہی راستے ایک جگہ آ ملے اور ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

تمام ہی لوگوں کی پیشانیوں پر نفرت کی سلوٹیں پڑ گئیں۔ ہر ایک کے دل میں دوسروں کیلئے پکنے والا عداوت کا آتش فشاں پھٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام لوگوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سبھوں نے نفرت سے اپنے ہاتھ نیچے کر لئے..... مگر..... اب کی مرتبہ کسی بھی ہاتھ کی گرفت میں چاقو نہیں تھا..... نہ کسی میں بھالا..... نہ خنجر نہ تلوار اور نہ ہی نیزہ یا بندوق تھی..... بلکہ تمام ہی لوگوں کے ہاتھ خالی تھے۔

وہ اپنے ہاتھ خالی دیکھ کر طیش میں آ گئے..... مگر اس سے پہلے کہ وہ خالی ہاتھ ہی ایک دوسرے پر حملہ کرتے..... ان تمام ہی لوگوں کی آنکھیں چوندھیا گئیں..... کیونکہ وہی نور ان سبھوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے تھا جس کے دیدار کیلئے وہ اس سفر پر چلے تھے۔

ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر حیران پشیمان اور شرمندہ کھڑا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بے مثل و بے مثال نور کو تکے جا رہا تھا جس کی ٹھنڈک دل و دماغ کو ایک عجیب سا سرور عطا کر رہی تھی..... جس کی خوشبو رگ رگ میں گھستی محسوس ہو رہی تھی اور نگاہوں کی حد سے بھی پرے تک وہی نور پھیلتا چلا جا رہا تھا.....

□□

اندرا ترتی تاریکی

سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس گہرے گندمی رنگ کی جھریوں والی کھال میں لپٹے ستر سالہ بھگت رام اپنی گھاس پھونس کی جھونپڑی کے دروازے پر آئے۔ ان کی نظریں آٹھ دس قدم کے فاصلے پر موجود پیپل کے درخت کے پتوں سے الجھ گئیں۔ ان سے رہائی پاکر تنے سے پھسلتی ہوئی جڑوں کے پاس موجود پیر بابا کی قبر پر جا رکیں اور وہ چونک پڑے انھوں نے دو ایک مرتبہ اپنی جھریوں والی پلکیں جھپکائیں۔ سر کے مکمل سفید بالوں کو کھجایا اور سوچنے لگے۔

"یہ مندر اور مسجد آج پیر بابا سے ملنے نہیں آئے!! سلامی دینے نہیں آئے؟..... مگر کیوں؟؟"

جواب میں ان گنت لاشوں کے ساتھ ہی مندر مسجد کی دیوارں کے ملبے بھی ان کے ذہن میں پھیل گئے۔ انھوں نے افسوس بھری ایک لمبی سانس باہر خارج کی۔ گویا اپنے ذہن میں بکھری لاشوں اور مندر مسجد کے ملبوں کو نکال باہر کرنا چاہتے ہوں مگر ملبے ان کے ذہن کی سطح پر پھیلے رہے..... ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر پڑے رہے اور خون میں لت پت لاشیں ادھر ادھر بکھری پڑی رہیں۔

انھوں نے دو ایک گہری گہری سانس لے کر اپنے ہاتھوں کا چھجہ بنا کر آنکھوں پر لگایا اور ندی کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں ندی کے پانی کی کلکلاہٹ بڑی رنجیدہ اور کمزور سی محسوس ہوئی۔ ندی کے اس پار ایک آدھ میل دور بسنے والے شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کے عقب میں اترنے کی تیاری کرنے والا سورج بہت غمزدہ اور اداس دکھائی دیا اور ندی کے اس پار ندی کے سینے پر کھڑے پل کے پاس بکھرے پڑے مندر مسجد کے ملبے ایک دوسرے سے گلے مل کر روتے محسوس ہوئے۔

بھگت رام نے روتے سسکتے ملبوں سے نظر ہٹا کر پیر بابا کی قبر کو دیکھا۔ قبر کے پاس پیپل کے تنے کا سایہ اکیلا بڑا ہی اداس دکھائی دیا۔

''تنے کا یہ سایہ روزانہ مندر مسجد کے سایوں کے ہمراہ پیر بابا سے مل کر کتنا خوش دکھائی دیتا تھا.....''

ان کے سائے روز ہی پیر بابا سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انھیں پیر بابا کی قبر کے پاس دیکھ کر وہ خود بھی خوش ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں ملتا دیکھ کر بھگت رام کو لگتا تھا جیسے مندر مسجد کے وہ سائے قبر کے اندر آرام کر رہے پیر بابا سے باتیں کر رہے ہوں۔

''پیر بابا! تم بہت اچھے ہو.....''

''ہاں! بہت ہی اچھے.....''

''تم نے ہی تو ہمیں بنوایا تھا پیر بابا''

''ورنہ اس گاؤں کے لوگ تو دنگا کرنے جا رہے تھے ہمارے نام پر''

''تجھے معلوم ہے رامو! بہت بڑا دنگا رکوایا تھا پیر بابا نے''

بوڑھے بھگت رام کے ذہن میں اپنی ماں آرتی دیوی کی آواز گونجی وہ ان کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پیر بابا کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔

''نہیں ماں جی! مجھے نہیں پتہ۔ کیسے رکوایا تھا دنگا انھوں نے''؟

بھگت رام کو بچپن میں کیا گیا اپنا سوال یاد آیا جس کے جواب میں ان کی ماں کے لب ہلتے ہوئے انھیں دکھائی دیئے۔

''تیرے دادا بتاتے تھے رامو بیٹا! ان کے بھی بچپن کی بات ہے۔ جب وہ چھوٹے تھے نا..... تیرے برابر..... چھ سات برس کے..... تب معلوم ہے کیا ہوا تھا؟..... ندی کے پل کے پاس ایک طرف اپنے گاؤں کے سب ہندو تھے..... تو دوسری طرف سارے مسلمان..... دونوں ہی طرف کے لوگوں نے لاٹھی، ڈنڈے، تلوار، گپتی، چھری اور چاقو اٹھا رکھے تھے..... ہندو بولتے تھے کہ پل کے پاس صرف مندر ہی بنے گا اور مسلمان کہتے تھے نہیں..... صرف مسجد بنے گی..... اور اسی بات پر وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے..... مگر..... اس سے پہلے کہ وہ لوگ ایکدوسرے پر حملہ کرتے..... ندی کی طرف سے ایک تیز آواز ابھری تھی۔

''ٹھہرو!.....''

ہندو مسلم سبھوں نے سر گھما کر ندی کی طرف دیکھا۔ ندی کا پانی بڑے زور و شور کے ساتھ بہہ رہا تھا مگر وہ ندی میں کھڑے تھے اور ندی کے پانی پر کھڑے تھے۔ سفید کرتا پاجامہ اور ہرے رنگ کی بڑی سی

پگڑی، سفید گھنی داڑھی میں ان کا چہرہ بڑا نورانی دکھائی دے رہا تھا اور وہ ندی کے درمیان پانی پر یوں کھڑے تھے جیسے زمین پر کھڑے ہوں..... پھر انھوں نے اپنا قدم پانی پر آگے بڑھانا شروع کیا..... ان کے پیر تک نہیں بھیگ رہے تھے پانی سے..... سب انھیں پانی پر چلتا دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے..... ہندو انھیں بھگوان کا اوتار سمجھ رہے تھے تو مسلمان ولی اور اللہ والا..... اور جب انھیں اس جھگڑے کی وجہ معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہو گئے..... انھوں نے خفا ہو کر لوگوں کو سمجھایا تھا۔

''عجیب ہو تم لوگ بھی..... ارے اللہ اور بھگوان کے گھروں کی خاطر ایک دوسرے کو قتل کرنے جا رہے ہو..... ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہو تم لوگ..... ذرا سوچو..... جس مسجد کی تمام دیواریں انسانی خون سے رنگی ہوئی ہوں کیا خدا اس مسجد سے خوش ہو سکتا ہے؟..... اور جس مندر کی بنیاد انسانی لاشوں پر رکھی گئی ہو کیا بھگوان اس مندر سے کبھی خوش ہو سکتا ہے؟..... ارے عقل کے مارو..... نہ تمہارا بھگوان ایسا مندر پسند کرے گا نہ ہی تمہارا خدا ایسی مسجد سے خوش ہوگا..... بند کرو یہ لڑائی جھگڑا..... چھوڑو یہ نفرت کا کاروبار..... جاؤ اور جا کر پل کے اسی طرف دائیں جانب مندر بنا لو اور بائیں جانب مسجد..... مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا..... اور لڑائی بھی.....''

''لڑائی..... لڑائی..... لڑا..... ای..... لڑا..... ای ی''

بھگت رام چونک گئے۔ وہ چھوٹی سی لڑائی ہی تو تھی۔ گاؤں کے دو بچوں میں لڑائی ہوئی تھی..... سلمان اور شراون آپس میں لڑے تھے..... پھر دونوں کے گھر والے اُلجھے اور پھر پورا گاؤں ہی الجھ کر رہ گیا تھا اس لڑائی میں..... اور کچھ اتنا الجھا کہ انگنت لاشیں گرا ڈالی گئیں..... سینکڑوں گھر پھونک ڈالے گئے..... لوٹ مار کی گئی..... گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عصمت پامال کی گئی..... لوگ زندہ جلائے گئے اور پیر بابا کی باتوں پر بنائے گئے مندر مسجد گرا ڈالے گئے..... شام کے دھندلکوں میں ہندوؤں کے ہجوم نے مسجد توڑی..... اور جب صبح اٹھے مندر بھی ملبے کا ڈھیر دکھائی دیا..... جن کے سائے بھگت رام کے آنگن میں موجود پیر بابا کی قبر کو روزانہ سلامی دینے آتے تھے۔

''تجھے معلوم ہے رامو! یہ پیر بابا کی قبر اپنے آنگن میں کیسے بنی تھی؟''

اپنی ماں آرتی دیوی کا سوال یاد آتے ہی بھگت رام کی نظر اپنے آنگن کے پیر بابا کی قبر پر جا پڑی اور بچپن میں ماں کے سوال پر نفی میں ہلتا ہوا سر انھیں دکھائی دیا اور ان کی ماں انھیں سمجھاتی ہوئی دکھائی دی۔

''پیر بابا! اس کے بعد اپنے ہی گاؤں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ گاؤں کے ہندو مسلمان سبھی ان کا

بہت احترام کرنے لگے۔ ان کی خواہشوں کا احترام کرنے لگے..... وہ پیر بابا کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگے..... مگر شاید نیک لوگ کم ہی زندگی لیکر آتے ہیں..... پیر بابا بھی بہت جلد ہم سے جدا ہو گئے اور انھوں نے آخری وقت میں ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ مندر مسجد کے سائے شام کو جہاں بھی ملیں وہیں ان کی قبر بنا دی جائے..... چونکہ شام کو مندر مسجد کے سائے ہمارے آنگن میں آ کر ملتے تھے اس لئے انہیں یہاں دفن کر دیا گیا۔ شروع شروع میں تو گاؤں بھر کے لوگ آ آ کر پیر بابا کی قبر پر پھول چڑھاتے تھے..... مگر وقت گذرنے کے ساتھ ہی دھیرے دھیرے لوگوں کا آنا بند ہوتا گیا اور لوگ آہستہ آہستہ انھیں بھولتے چلے گئے..... مگر بیٹا! تیری دادی برابر انھیں یاد رکھتی تھی..... وہ انھیں نہیں بھولی..... وہ جب بھی پیپل پر پوجا کا سیندور لگاتی پیر بابا کی قبر پر بھی لگا دیتی..... آرتی اتارتی تو چراغ کی آنچ پیپل کو دے کر دیا قبر کے کنارے رکھ دیتی۔ وہ جب بھی دکھی ہوتی پیر بابا سے باتیں کر کے اپنا جی ہلکا کر لیتی۔ وہ خوش ہوتی تو پیر بابا کو ضرور یاد کرتی..... تجھے تو یاد ہی ہوگا رامو کہ جب تو امتحان دینے جاتا تھا اسکول کا..... تو دادی تجھ سے کہتی تھی کہ پیر بابا کا آشیرواد لے کر جانا..... تو پیر بابا کی قبر پر ماتھا ٹیک کر جاتا تھا اور ہمیشہ ایک نمبر سے آتا تھا..... اور تیری دادی یہ بھی تو کہتی تھی کہ کوئی بھی مصیبت ہو..... پیر بابا کو ضرور یاد کرنا..... وہ دور کرا دیں گے تیری مصیبت....."

"دور کرا دیں گے تیری مصیبت..... دور کرا دیں گے تیری مصیبت..... مصیبت..... تیری مصیبت..... مصیبت..... مصی بت..... مصی....."

بھگت رام نے ایک سرد آہ بھری۔ وہ مصیبت ہی میں تو تھے..... ان کا پورا گاؤں مصیبت میں تھا..... فساد کی مصیبت میں..... دنگے کی لپیٹ میں..... دنگے کی مصیبت میں۔

انھوں نے دو ایک مرتبہ اپنی جھریوں والی پلکیں جھپکیں۔ اپنی کمزور اور ناتواں نظروں سے پیر بابا کی قبر کو دیکھا۔ پل کے پاس ندی کے دامن میں بکھرے پڑے مندر مسجد کے ملبوں کو دیکھا اور جھونپڑی کے اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آئے تو ان کے منہ ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے سر پر ہرے رنگ کا ایک رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ سیدھے پیر بابا کی قبر کے پاس جا بیٹھے۔ ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر دایاں انگوٹھا اپنی تھوڑی سے لگایا اور سر جھکا لیا۔ ان کے ہاتھ سینے سے جا لگے اور وہ گہری گہری سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں پیر بابا سے کہنے لگے۔

''یا پیر بابا..... بند کروادو نا یہ جھگڑے..... رکوادو نا یہ لڑائی..... ختم کروادو نا یہ لوٹ مار بابا..... یہ قتل..... یہ فساد..... یہ خون کی ہولی..... رکوادو نا پیر بابا یہ سب..... رکوادو نا یہ سب..... رکوا.....''

لوگوں کے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں سن کر بھگت رام نے اپنی آنکھیں کھولی اور دیکھا۔ ایک ہجوم پل پار کر کے ان کی طرف تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ ہجوم کے لوگوں نے لاٹھی، ڈنڈے، تلواریں، گپتیاں اور تیل کے کنستر اٹھا رکھے تھے۔

''جانے دے اے..... چھوڑ ان کو..... مسلمان ہیں..... ہاں مسلمان ہے بڈھا..... اے چھوڑ اے..... اپنے ہی والا ہے..... چلو آگے چلو..... چھوڑ نا مت سالوں کو حرامی کہیں کے..... نعرۂ تکبیر..... اللہ اکبر..... نعرۂ تکبیر..... اللہ اکبر.....''

مشتعل لوگوں کا وہ ٹولہ نعرے لگاتا..... چیختا..... چلاتا اور شور مچاتا ہوا آگے بڑھا تو بھگت رام نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''کیا ہو گیا ہے بابا ان لوگوں کو؟..... کیوں یہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں؟..... کون ہے جو اُن کو سمجھائے گا..... تم ہی سمجھا دو نا بابا..... تم ہی سمجھا دو..... تم ہی بابا.....''

''مار سالے کو..... مار بڈھے کو..... مسلمان ہے سالا..... حرام خور..... مار سالے کو..... مار.....''

بھگت رام کے کانوں سے لوگوں کی آوازیں ٹکرائیں..... وہ چونک گئے..... انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں..... مگر..... اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے دو آوازیں ابھریں ''جئے رام جی کی..... جئے رام جی کی'' اور دو گپتیاں پشت سے ان کے اندر اترتی چلی گئیں..... ان کے منہ سے نکلا ''ہے رام''

مگر بپھرے ہوئے لوگوں کا وہ ہجوم رام، ہنومان اور بھوانی کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ اوندھے منہ پیر بابا کی قبر پر لڑھک گئے۔ ان کے بدن سے نکلنے والے خون کے دھارے قبر کو سرخ کرتے رہے۔ ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں..... مگر..... اپنے سرہانے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ پیر بابا کے قدموں میں پڑے تھے۔ پیر بابا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کا چہرہ رنجیدہ تھا..... ان کے سر پر پگڑی نہیں تھی..... ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ان کی تیز سانسوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے وہ بڑی دور سے دوڑتے بھاگتے چلے آئے ہوں اور جہاں سے بھی آئے ہوں وہاں بھی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہو..... تبھی تو ان کے سفید کپڑے بھی خون میں لت پت دکھائی دے رہے تھے۔

پیر بابا نے بھی بھگت رام کے خون میں لت پت وجود کو دیکھا اور افسوس بھرے انداز میں سر نفی میں ہلا کر اپنا رخ ندی کی طرف کر لیا۔

ندی کی طرف ان کا رخ ہوتے ہی بھگت رام نے دیکھا..... ان کی پشت سے بھی خون کے دو دھارے نکل کر ان کے کپڑوں کو سرخ کرتے ہوئے زمین میں جذب ہو رہے تھے اور اسی حالت میں پیر بابا نے اپنا قدم اٹھانا چاہا تو لڑکھڑا گئے۔ بھگت رام نے اپنا ہاتھ بیساختہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے وہ ان کے سہارے سنبھل ہی تو جائیں گے۔ پیر بابا واقعی سنبھل گئے۔ انھوں نے ندی کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک ہی ندی کا پانی طوفانی شور سے بہنے لگا۔ بھگت رام نے پوری طاقت لگا کر اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر دیکھا۔

پیر بابا کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی ندی کے طوفانی شور میں شدت آ رہی تھی اور ندی کے اُس پار اونچی اونچی عمارتوں میں منہ چھپانے والا سورج اداس ہو کر ڈھلا تا جا رہا تھا..... منظر تاریک ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں اور آنکھوں سے اندر اترنے والی تاریکی ان کے ذہن و دل سے ہوتی ہوئی ان کی روح کی گہرائیوں میں بھی پھیلتی جا رہی تھی۔

□□

باتیں میرے ہمعصروں کی.....

ہم عصروں میں اپنی الگ شناخت بنانے والا فنکار

ہمعصر قلمکاروں کی بھیڑ میں اپنی ایک الگ شناخت بنانے کی مشکل مہم سر کرنے کیلئے طاہر انجم صدیقی نے نہ کسی کی حق تلفی کی ہے اور نہ ہی کسی کی دل آزاری بلکہ انہوں نے اپنے فن کی پختگی سے اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم عمری کے باوجود بھی ان کے اندر ادراک وفہم کا ایک دریا موجزن ہے۔ مجھے امید ہے کہ ظلم و بربریت کے شکار افراد کی ادبی حلاوت اور بے رحم حقیقت نگاری کے ساتھ بیان کی گئی ان کی کہانیاں ادبی ذوق اور دردمند دل رکھنے والوں کو ضرور متاثر کریں گی۔ ——— (عارفی کلیم احمد)

مظلوموں کے آنسو پونچھنے والا افسانہ نگار

طاہر انجم ۱۹۹۲ء کے آس پاس سے منظر عام پر آنے والے ایک ایسے فنکار ہیں جنہوں نے بہت ہی کم وقت میں ہر قسم کے افسانے لکھ کر اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک حساس ادیب اور خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص دوست بھی ہیں۔ ان کی سوچ ان کی اپنی عمر سے زیادہ ہے۔ وہ اپنے قلم کے ذریعے سماج میں پھیلی برائیوں اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بھی بلند کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے لفظوں سے مظلوموں کے آنسو پونچھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ——— (آصف اقبال مرزا)

پُر سرور افسانہ نگار

صبح سے شام تلک مختلف مسائل سے دوچار ہونے اور مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتے جب طبیعت مکدر ہونے لگے تو آپ طاہر انجم صدیقی سے ملئے۔ جناب آپ سے انہیں مسائل اور اسی گردشِ دوراں کے متعلق کچھ اس انداز سے گفتگو کریں گے کہ آپ پر ایک کیفیت طاری ہو جائیگی اور آپ ان ہی تلخیوں میں ایک لذت و کیف کو محسوس کئے بنا نہیں رہ سکیں گے اور طاہر کی یہی خوبی ان کے افسانوں اور اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ — (حبیب الرّحمٰن وارث)

آہنی مشینوں کے شہر کا محنت کش فنکار

طاہر انجم صدیقی شب و روز آہنی مشینوں سے لڑ کر زندہ رہنے والوں کے شہر کے محنت کش قلمکار ہونے کے سبب نئے لکھنے والوں کی صفوں میں کافی آگے کھڑے نظر آتے ہیں۔ رشوت، سیاست، لال فیتا شاہی، اخلاقی قدروں کی بدحالی سرمایہ دارانہ نظام، نام نہاد جمہوریت، انسانیت اور دبے کچلے مظلوم افراد ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ جنہیں برتتے ہوئے وہ قاری کو مایوس نہیں ہونے دیتے۔ مجھے امید ہے کہ وہ "بلیک اینڈ وہائٹ" کے ذریعے ادب میں اپنا ایک مقام ضرور بنائیں گے۔ ——— (نعیم الرّحمٰن شعیب)

بھرپور کہانی پن کا مظہر ..... بلیک اینڈ وھائٹ

طاہر انجم صدیقی کے قلم کی روانی، فن کی پختگی اور دلیرانہ حقیقت نگاری کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی عمر رسیدہ فنکار اپنے فن کے جلوے قرطاس پر بکھیر رہا ہو۔ وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ وغیرہ تحریکوں سے قطعی متاثر نہیں لگتے اور اپنے

گرد و پیش سے کردار، واقعات اور کہانی کا انتخاب کرکے افسانوں کو بڑے سلیقے اور منفرد انداز میں سجا سنوار کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔۔۔۔۔ افسانوں سے کہانی پن کے اختتام کے شاکی افراد اگر "بلیک اینڈ وہائٹ" کا غیر متعصبانہ مطالعہ کریں تو ان کی شکایت افسانہ بہ افسانہ دم توڑتی چلی جائے گی۔ **(محمد رفیع الدین مجاهد ، اکوله)**

دُنیائے ادب کا روشن ستارہ

"طاہر انجم صدیقی" یہ نام ادبی دنیا میں گذشتہ دہائی سے جگمگا رہا ہے۔ مقامی و بیرونی ادبی شخصیات اس کا اعتراف کر چکی ہیں۔ "بلیک اینڈ وہائٹ" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی تحریر قارئین کے دلوں کو چھو لے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ——— **(قاضی اکرام الدین)**

استحصال و نا انصافی کے خلاف قلم اٹھانے والا نوجوان

عام طور پر ایک نیا افسانہ نگار جب قلم اٹھاتا ہے تو "محبت" موضوع کا ہی انتخاب کرتا ہے مگر طاہر انجم صدیقی نے زمانے کے نشیب و فراز، معاشرتی اور انسانی استحصال کو دیکھا ہے۔ اسی استحصال و نا انصافی کو دیکھ کر اصلاح کی غرض سے ان کے دل سے ایک آواز ابھری جو "بلیک اینڈ وہائٹ" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کرے یہ مجموعہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ آمین۔ ——— **(پینٹر نفیس احمد)**

ہمہ جہت پہلوؤں کا عکاس

ایک آئینہ کسی بھی شے کے تمام ظاہری و حقیقی وجود کو ظاہر کرتا ہے مگر طاہر انجم صدیقی اپنے فن کے آئینے میں ظاہر کے ساتھ ہی باطن کو بھی ہمہ جہت پہلوؤں کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنے کے لئے نہ دقیق الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہی فضولیات، لغویات اور جنسیات کی بلکہ وہ نہایت ہی سادہ و سلیس انداز میں اپنے افسانوں کی فضا، کرداروں اور اپنے مقصد کو ہمارے سامنے واضح کر دیتے ہیں۔ ——— **(احمد شفیق)**

زندہ حقیقتوں پر مشتمل نام "بلیک اینڈ وہائٹ"

دل کے خوابیدہ مضامین کو لفظوں کا الماس عطا کر کے انہیں برتنے کے ہنر سے واقف برادرم طاہر انجم صدیقی کے اولین افسانوی مجموعے کی پذیرائی اس لئے لازمی ہے کہ خود پوری دنیا بھی بلیک اینڈ وہائٹ کے درمیان اپنی شناخت بناتی ہے جو صدیقی صاحب کے مجموعہ کا ٹائٹل بھی ہے اور ایک زندہ حقیقت بھی۔ ——— **(انصاری عبداللہ ہلال)**

ایک اچھا ادیب ایک اچھا انسان

لکھنا سب کو آتا ہے مگر کیا لکھنا ہے یہ کچھ ہی لوگوں کو آتا ہے اور ان ہی کچھ لوگوں میں ایک نام طاہر انجم صدیقی کا بھی ہے۔ ان کا قلم سماج میں پھیلی برائیوں، ناہمواریوں، ناانصافیوں اور زندگی میں بکھرے پڑے ان گنت مسائل پر خوب چلتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا فن جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ——— **(ہارون اختر)**

محیط از ماضی تا مستقبل "بلیک اینڈ وہائٹ"

موضوعات سے پُر دنیائے ادب میں کسی ایک موضوع کو اپنے رشحاتِ قلم کی صورت میں قرطاس پر بکھیر دینے کے بہترین فن سے واقف ہیں طاہر انجم صدیقی صاحب جن کے افسانے، افسانے کی روایات سے دامن گیر ہوتے ہوئے جدت کی دہلیز پر دستک دے کر سنہرے مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ ——— **(رئیس ستارہ)**

معمولی و غیرمعمولی باتوں کو بیان کرنے والا قلمکار

عصر حاضر کے بہترین افسانہ نگار" طاہر انجم صدیقی" کے افسانوں میں جہاں صحرا کی تمازت ہوتی ہے وہیں گلستان کی آسودہ ہوائیں بھی ہیں۔ وہ معمولی اور غیر معمولی باتوں اور انسان کے حالات کو بڑی چابکدستی سے اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے فن میں بلا کی پختگی ہے۔ اگر تکلف نہ کیا جائے تو مجھے طاہر انجم صدیقی میں کرشن چندر اور منٹو کے فن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ——— (عبد الرّحمٰن اختر)

خدا پر توکّل رکھ کر قلم کو ہتھیار بنا لینے والا فنکار

"بلیک اینڈ وہائٹ" کے افسانوں کے کردار ظلم و ناانصافی، غربت و احساس محرومی کے زہر سے ہر روز موت کی نیند سو کر دوسرے ہی روز صبح کے سورج کی طرح جاگ اٹھتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر پابلو پکاسو کی مشہور زمانہ پینٹنگ "گوئرنیکا" کے دردناک اور تکلیف دہ حال میں چیخنے والے گھوڑے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جسے پکاسو نے توبرش سے تخلیق کیا ہے مگر طاہر انجم صدیقی نے اپنے قلم سے پاگو، پاپو کاکا، ایزو دادا، شاہد خان جیسے کرداروں کو تخلیق کر کے قلم کو ظلم کے خلاف ایک ہتھیار بنالیا ہے۔ وہ اپنی نجی زندگی میں سادہ لوح، منکسر المزاج اور بیباک طبیعت کے مالک ہونے کے علاوہ ایک افسانہ نگار، شاعر، طنز و مزاح نگار، بچوں کے ادیب اور رنگوں سے کھیلنے والے ایک مصور بھی ہیں۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ انہیں دونوں جہاں میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ ——— (عزیز اعجاز)

اپنے لفظوں میں حقائق بیان کرنے والا فنکار

طاہر انجم صدیقی کسی دولت مند شخصیت کا نام نہیں بلکہ محنت کش طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک خوبرو نوجوان کا نام ہے۔ انہیں افسانہ نگاری و شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "بلیک اینڈ وہائٹ" کے لفظوں میں چھپے حقائق اپنے دیرپا اثرات مرتب کریں گے۔ ——— (ابدال احمد)

"بلیك اینڈ وهائٹ" بدی کے منه پر زناٹے دار طمانچه

طاہر انجم ادبی حلقوں میں نوعمر مگر پختہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ محنت کش طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود ادبی سرگرمیوں میں منہمک رہنے کی بنا پر میرا یہ نظریہ ہیکہ آسودہ حال مصنف ادب لکھتے ہیں مگر طاہر جیسے آشفتہ سروں کے سینوں سے ادب رستا ہے اور قاری کے ذہن و دل کو سیراب کرتا ہے۔ ——— (عبید احمد عطاء الرّحمٰن)

تاجِ شبِ تاریك

ظلم و بربریت اور استحصال کے مہیب اندھیروں میں آسودہ منزل کی یقین دہانی کے لئے ادنیٰ و اعلیٰ محرکات کو جدید، روایتی، تمثیلی، استعاراتی، علاماتی اور سادہ و سلیس زبان کا پیراہن عطا کر کے اپنے فن کے جگنوؤں کی مسرت آگیں دفعوں تاک زرد روشنی سے ذہن پر چھا جانے والے فنکار کا نام ہے طاہر انجم صدیقی۔ وہ اپنے افسانوں کی تھیم و کردار کا تعین روزمرہ کی زندگی میں شکست و ریخت سے دست و گریباں رہنے والے انسان اور اس کے مسائل سے کر کے واقعات، واردات، حادثات کو پورے فنی لوازم کے ساتھ پر کشش بنا دیتے ہیں۔ فکر و شعور کی پختگی کے پیش نظر ان کی افسانہ نگاری کا قد جسمانی عمر سے قدرے اونچا ہے۔ وہ مسائل زمانہ سے جوجھتے ہوئے اپنے قلم کی جولانیوں و گل فشانیوں کو صحیح سمت میں رکھتے ہوئے کہانیوں سے نبرد آزما ہیں۔ ——— (عمران جمیل)

— نام —

محمد طاہر ابن محمد صدیق

قلمی نام : طاہر انجم صدیقی

• تاریخ و مقام پیدائش •

یکم جون ۱۹۷۷ء

کمال پورہ، مالیگاؤں

پیشہ : اسکرین پرنٹنگ

تعلیم : A.T.D., C.T.C.

— لکھنے کی ابتدا —

1992 کے آس پاس

— پتہ —

31، انصار گنج، پہلی گلی، مالیگاؤں

Mob: 9371570483

— آئندہ تصانیف —

☆ تاثیر (شاعری)

☆ پیاز کا پہلا چھلکا (طنز و مزاح)

☆ سوالیہ نشان (افسانے)

☆ انیک رنگ (متفرقات)

☆ دنیا بچوں کی (ادب اطفال)

طاہر انجم صدیقی اپنے ہم عمر نوجوانوں میں سب سے تیز قلمکار ہیں۔ جاسوسی ناولوں سے مطالعے کی ابتدا کرنے والا یہ قلمکار بہت جلد ادبی تحریروں خصوصاً افسانوں کے مطالعے کی طرف مائل ہو گیا۔ اسی مطالعے نے ان کے اندر لکھنے کا ابال پیدا کیا۔ تخلیقی صلاحیت فطرت میں موجود تھی۔ مختصر افسانوں سے شروعات کی جن کی اشاعت نے حوصلوں کو جلا بخشی اور ان کا ادھیڑ قلم شاہراہ افسانہ پر تیز رفتاری سے چل پڑا۔ نتیجہ افسانوں کے مجموعے "بلیک اینڈ وہائٹ" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

ان افسانوں میں بیان کردہ کردار ہمارے اردگرد رات دن حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، طاہر انجم صدیقی بڑی چابک دستی سے ان کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنے تشکیل کردہ افسانوی معاشرے کا ایک فرد بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمارے سماج کا ہی نہیں، خود افسانہ نگار کی زندگی کا عکس بھی صاف دکھائی دیتا ہے جس نے غریبی اور استحصال کو دیکھا ہی نہیں جھیلا بھی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ "بلیک اینڈ وہائٹ" کے افسانے معاشرے کے دبے کچلے، تباہ حال، محروم اور مظلوم افراد کی فنکارانہ کردار سازی اور تصویر کشی کا مرقع نظر آتے ہیں۔

افسانوں کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ اسلوب میں تیکھا پن ہے۔ الفاظ، تراکیب اور تمثیلات کو بے تکلفانہ برتا گیا ہے۔ کم عمری میں بھی افسانہ نگار کا سماجی شعور کافی پختہ ہے۔ ان کے افسانے سماج کیلئے تنقید برائے اصلاح کا حکم رکھتے ہیں۔ کہانی کہنے کا ان کا اپنا انداز ہے۔ وہ واقعہ کو قصہ، حادثے کو کہانی اور حقیقت کو افسانہ بنا دینے کا فن جانتے ہیں۔ فن افسانہ سے اُن کی واقفیت اور حساس دل و بیدار شعور کی کارفرمائیاں ان افسانوں سے نمایاں ہیں۔ بھرپور کہانی پن، زبان و بیان پر قدرت اور اخلاقی اقدار کی زریں لہروں نے ان کے افسانوں کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ یہ افسانے مسائل حیات کا آئینہ بھی ہیں اور انسانی دردمندی کے جذبات کی صدائے بازگشت بھی۔ ان کی خود اعتمادی اور لگن یقیناً انہیں بلندیوں تک لے جائے گی۔

طاہر انجم صدیقی کے اولین افسانوی مجموعے کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد اور مستقبل کی کامرانیوں کے لئے دعائیں۔

ڈاکٹر الیاس صدیقی (M.A., B.Ed, LL.M., Ph.D.) مالیگاؤں